اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
ڈاکٹر تنویر عباسی: شخصیت اور فن
ڈاکٹر ادل سومرو

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر تنویر عباسی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر تنویر عباسی
شخصیت اور فن

ڈاکٹر ادل سومرو

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	افتخار عارف
منتظم	محمد انور خان
تدوین و طباعت	سعیدہ درانی
سکیچ	احمد حبیب
اشاعت	2007
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/176 روپے
	پیپر بیک: -/166 روپے

ISBN: 978-969-472-228-3

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز اہل قلم کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال وآثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور نثر نگاروں، شاعروں، اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

تنویر عباسی سندھی زبان کے صاحب اسلوب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز محقق کی حیثیت سے بھی جداگانہ شناخت کے حامل ادیب ہیں۔ سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں پر غیر معمولی دسترس ان کا امتیاز ہے۔ صوفیائے کرام کی حیات وخدمات اور پیغام، تنویر عباسی کا نہ صرف خاص موضوع تھا بلکہ ان کا اسلوب حیات بھی صوفیانہ رہا ہے۔ انہوں نے زندگی بھر اس میدان میں بے حد نمایاں خدمات سرانجام دیں اور صوفی دانش کے حوالوں سے بے مثال علمی تحقیق کے عمدہ نمونے قلم بند کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ تنویر عباسی ایک صاحب اسلوب تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ بالغ نظر محقق کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

پیش نظر کتاب" تنویر عباسی : شخصیت اور فن" ملک کے معروف ادیب، شاعر، محقق ڈاکٹر ادل سومرو نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب تنویر عباسی کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ" پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

تنویر عباسی سندھی زبان کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور ہونے کے ساتھ ہردلعزیز شخصیت کے مالک بھی تھے۔ شاعری میں اُن کا ایک بلند مقام ہے لیکن تحقیق کے سلسلے میں بھی اُن کا کام انفرادی نوعیت کا ہے۔ خصوصاً لطیفؒ شناسی کے حوالے سے، شاہ لطیفؒ کی شاعری کا جدید تنقیدی نقطۂ نظر سے انہوں نے جو تجزیہ کیا ہے، اُس کی تعریف مختلف مکاتبِ فکر کے ناقدین نے بھی کی ہے۔ بہت کم شاعر ہوتے ہیں جو کہ شاعری اور تحقیق میں یکساں مقام رکھتے ہوں، اور تنویر عباسی ایسے ہی شاعر تھے جنہیں تحقیق میں بلند رتبہ حاصل ہوا۔

اس مختصر مقالے میں تنویر عباسی کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے لکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ ان محدود صفحات میں اُن کی شخصیت اور فن کے بارے میں قاری کو کم از کم اتنی معلومات ضرور فراہم کی جائیں کہ وہ تنویر عباسی کو بحیثیت ایک شاعر، ادیب اور دانشور پہچانے اور اُس پر عیاں ہو سکے کہ تنویر کون تھے۔ تنویر عباسی نے ساری زندگی اپنے نصب العین سے سچی وابستگی کے ساتھ گزاری اور وقت کو کبھی ضائع نہ ہونے دیا۔ وہ متحرک شخصیت کے مالک اور باعمل انسان تھے۔ طبعاً صوفی منش تھے، کسی کا دل دکھانے والے عمل اور اظہار سے خود کو بچاتے تھے۔ ادبی تحاریک میں بھی ان کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ شاعری میں انہوں نے میری رہنمائی کی، اور میری یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے میں، یونیورسٹی کی طرف سے وہ میرے گائیڈ تھے۔ وہ اپنے رویے میں بھی بڑے انسان تھے، کبھی بھی اپنی علمیت اور دانائی کو تکبر کے قریب نہ جانے دیا۔ اس کتاب میں تنویر عباسی کے جو بھی اشعار ہیں، ان کا اردو ترجمہ میں نے ہی کیا ہے۔

ڈاکٹرادل سومرو

زندگی

خاندانی پس منظر

تنویر کے والد گل حسن عباسی ایک متقی اور ایمان دار انسان تھے،ان کی پیدائش 1900 میں ہوئی، گل حسن عباسی نے ناز ہائی سکول خیر پور سے میٹرک پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے جھونا گڑھ بھی گئے۔اس وقت خیر پور ریاست کے والی میر امام بخش تھے۔ریاست کے ایک وزیر نے گل حسن عباسی کے والد کو ہدایت کی کہ وہ اپنے بیٹے کو جونا گڑھ تعلیم کے لیے بھیجے، بصورتِ دیگر انہیں جیل بھیجا جائے گا۔

گل حسن عباسی کلرک سے ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنر بنے۔وہ روزہ و نماز کے پابند، مذہبی احکامات پر سختی سے عمل کرنے والے ایک آزاد خیال اور کشادہ نظر انسان تھے۔رشوت اور ناجائز ذرائع سے دولت بٹورنے کے خلاف تھے چنانچہ جائیداد وغیرہ بنانے سے بھی گریزاں رہے۔دو شادیاں کیں، جن میں سے سات بیٹے، غلام النبی، عبدالنبی، نورالنبی (تنویر عباسی)، اعجاز النبی، الطاف النبی، ارشاد النبی اور تین بیٹیاں عنایت خاتون، نور جہاں اور نسیم پیدا ہوئیں۔

گل حسن عباسی ۱۹۸۸ء میں ۸۸ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔عنایت خاتون، غلام النبی اور خادم النبی، سوبھوڈیرو میں ہی رہے۔وہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔غلام النبی اور خادم النبی، اپنے دادا کے ساتھ گاؤں میں اپنی زمینیں آباد کرتے رہے۔

نور جہاں بھی اپنے آبائی گاؤں میں رہیں۔ییسٹ بوناونچر سکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سماجی کاموں میں مصروف رہیں اور مقامی سطح پر سیاست میں بھی دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ٹاؤن کمیٹی سوبھوڈیرو کی دو مرتبہ چیئرپرسن بھی منتخب ہوئیں ہیں۔ادب سے بھی ان کو تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔

نسیم بھی تنویر کی طرح ڈاکٹر ہیں اور کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

عبدالنبی المعروف اے این بی عباسی، ایگزیکٹو انجینئر بنے اور اپنے شعبہ میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔والد کے انتقال کے بعد انہوں نے دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ شفقت بھرا رویہ رکھا۔

صوبائی سیکریٹری، چیئرمین این آئی ٹی، ممبر سندھ پبلک سروس کمیشن اور حکومت پاکستان میں اسٹیٹ منسٹر بھی رہے۔ منصوبہ بندی اور سماجی ترقیات کے حوالے سے ان کی بڑی خدمات ہیں۔

اعجاز النبی واپڈا میں انجینئر رہے ہیں۔ آج کل اپنی ایک ذاتی فرم چلا رہے ہیں۔

الطاف النبی، المعراف الطاف عباسی اور ارشاد عباسی جو کہ ارشاد پارس کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، دونوں سندھی ادب کے حوالے سے مشہور شخصیات ہیں۔

الطاف عباسی سے تنویر عباسی کی بہت دوستی اور محبت تھی۔ وہ پی سی ایس کر کے ڈائریکٹر ایکسائز کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۷۸ء میں نواب شاہ سے حیدرآباد اپنی گاڑی میں جاتے ہوئے ایک حادثہ میں اجل کا شکار ہو گئے۔ وہ ایک پیارے انسان اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''جڑواں چاند'' (جاڙا چنڊ) کے نام سے سندھی ادیبوں کی کوآپریٹو سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ الطاف عباسی کی المناک جدائی کا تنویر کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے الطاف کو یاد کرتے رہے۔ انہوں نے کئی نظمیں الطاف کی یاد میں لکھیں تھیں جو کہ ان کے مجموعۂ کلام ''یہ دھرتی'' میں موجود ہیں۔

تیرے بن یہ زندگی
جیسے لوہار کی دکان
آگ ہے بس ہر گھڑی

☆

وہ اپنا پیار تو نبھا گیا
لیکن مجھے بیابان میں
تنہا چھوڑ گیا
وہ تھوڑا سا وقت گزار کر
بہت جلدی چلا گیا
وہ شبنم کا اک قطرہ تھا
جس کی یاد میں میرے آنسو
رواں رہے ہیں

☆

پریتم گئے ہیں دور
ہم اس دیس کو جھوٹا جانتے ہیں
میرے لیے ہے رہ گئی باقی

تیرے پاؤں کی دھول
تم نے جو یہ دیس بسایا
وہی ہے سب کا دیس
ہم اس دیس کو جھوٹا جانتے ہیں

ولادت

تنویر عباسی کا جنم ریاست خیر پور میرس کے ایک قصبے سوبھو دیرو میں ۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ہوا۔ والدین نے نومولود کا نام نور النبی رکھا۔ جو آگے چل کر تنویر کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس وقت ریاستِ خیر پور تالپورانِ سندھ کے زیر انتظام تھی۔

تعلیم

تنویر عباسی کو سوبھو دیرو کے مکتب میں داخل کیا گیا لیکن والد کے مختلف شہروں میں تبادلے کی وجہ سے وہ ایک جگہ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ پہلی جماعت نوشہرہ فیروز اور میر پور خاص میں حاصل کی۔ دوسری جماعت سادھو ہیرانند اکادمی کراچی سے پاس کی۔ سیکنڈری، ڈبلیو بی ہائی سکول کراچی سے اور چوتھی سے میٹرک تک کی تعلیم، جے، وی ہائی سکول کراچی سے حاصل کی لیکن این جے وی ہائی سکول میں میٹرک مکمل نہ کر سکے۔ میٹرک کا امتحان انہوں نے ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول حیدرآباد سے پاس کیا۔ اسی طرح فرسٹ ایئر ڈی جے کالج کراچی سے اور انٹر (ایف۔اے) گورنمنٹ میڈیکل کالج جام شورو سے ۱۹۵۳ء میں پاس کیا۔ لیاقت میڈیکل کالج جام شورو سے ۱۹۶۰ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر بن گئے۔

ذھانت

تنویر عباسی بچپن سے ہی بہت ذہین اور شرارتی تھے۔ اپنے بھائیوں اور خاندان کے دیگر بچوں سے مختلف اور منفرد تھے۔ ان کی ذہانت کے حوالے سے، ارشاد عباسی (تنویر کے چھوٹے بھائی) لکھتے ہیں:

> ''نور النبی اور تنویر کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بچپن میں ذہانت کی وجہ سے سب اُسے ''سپر جینیئس'' کہتے تھے۔ سکول کی کتاب پڑھ کر اکثر اوراق پھاڑ

دیتے تھے۔ایک دفعہ بابا عبدالنبی نے تنویر کی پھٹی ہوئی کتابیں دیکھیں، جن
کے کچھ آخری اوراق بچے ہوئے تھے۔انہوں نے تنویر سے پوچھا کہ 'تم نے یہ
کیوں کیا ہے؟' تنویر نے ادب سے جواب دیا کہ 'بھائی سب یاد ہے' پھر کتابیں
رکھ کر کیا کروں گا۔اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو پوچھ لیجیے۔''

(مہران تنویر عباسی نمبر: صفحہ ۔۸۹)

تنویر عباسی کے خاندان میں اُن کے علاوہ تین اور افراد کے نام بحیثیت شاعر و ادیب گنوائے جاسکتے ہیں: ان کے دو بھائی الطاف عباسی اور ارشاد عباسی ہیں اور تنویر کی بڑی بیٹی پارس شاہد عباسی بھی خوش فکر شاعرہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔الطاف عباسی سندھی زبان کے ایک نمائندہ شاعر تھے اور تنویر کو بہت ہی پیارے تھے۔1942 میں الطاف کا جنم ہوا اور 1978 میں ایک روڈ حادثے میں اُن کا انتقال ہوگیا۔پہلا شعر 1958 میں نواب شاہ سے شائع ہونے والے مخزن'' آئینہ'' میں شائع ہوا۔شعری مجموعہ (جاڙا چنڊ) ''جڑواں چاند''، زندگی میں انہوں نے خود ترتیب دیا تھا، جو کہ ان کی وفات کے بعد ان کی خواہش کے مطابق رشید بھٹی کی پریس میں کمپوز ہوا اور ٹائٹل فتاح (شرجیل) نے بنایا۔سندھی ادیبوں کی کوآپریٹو سوسائٹی نے اُس مجموعۂ کلام کو 1979 میں شائع کیا۔ان کے مجموعے میں سے دو نظمیں پیش ہیں:

شاعر

ایش ٹرے جس طرح
آدھے جلے سگریٹوں
اور بیڑیوں کے ٹوٹے
اپنے اندر رکھتی ہے
اسی طرح میں ایک شاعر
مفلسوں، مظلوموں اور ٹھکرائے ہوئے
انسانوں کے دکھوں کو
اپنے دل میں جگہ دیتا ہوں

حادثے

میں نے کہا
ریل کی پٹڑیوں کی طرح
ہم ہمسفر ہیں، ساتھی ہیں
اور ہمیشہ ساتھ ہیں
لیکن کبھی نہ ملیں

تم نے کہا
ریل کی پٹڑیوں کو ہمیشہ
ایک فاصلے کے ساتھ

رہنا چاہیے
وہ اگر مل جائیں گی
یا ایک دوسرے کے نزدیک
آجائیں گے
تو بڑے حادثے ہوں گے

ارشاد عباسی، تنویر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ سول سروس کے انفارمیشن گروپ کے افسر ہیں۔ آج کل اسلام آباد میں قیام ہے۔ ان کو مطالعے سے خاص دلچسپی ہے۔ نثر اور نظم میں ان کی تخلیقات خاصی تعداد میں مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ شاعری میں ان کی پسندیدہ صنف نثری نظم ہے۔ ان کی نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جو ان کے قلمی نام ارشاد پارس سے شائع ہوئی ہیں۔ ارشاد عباسی کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا ہے۔

پارس شاہد عباسی، تنویر کی بڑی بیٹی ہیں۔ انہوں نے آرکیٹیکچر میں گریجویشن کی ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور پہلی نظم اپنے شاعر چچا الطاف عباسی کی حادثاتی موت پر لکھی تھی۔ ان کا شعری مجموعہ "ریشمی آواز" 1993 میں شائع ہوا جو انہوں نے اپنے والد اور والدہ کے نام منسوب کیا ہے۔ شادی سے پہلے وہ پارس عباسی کے نام سے لکھتی تھیں۔ ان کی تخلیقات مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی نظموں میں سے ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

ہر جگہ پر
وقت ہمارے ساتھ تھا

پھر بھی رہا وہ اجنبی
کب سے خلا میں بھٹکتے ہیں
نہ دھرتی ہے اپنی
نہ ہے اپنا آسماں
ہم ہیں ادھوری داستاں

پیشہ ورانہ مہارت

لیاقت میڈیکل کالج جام شورو (سندھ یونیورسٹی) سے 1960 میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد، تنویر عباسی نے اپنی شریکِ حیات ڈاکٹر قمر کے ساتھ حیدر آباد میں نہر پھلیلی کے نزدیک، نور محل سینما کے سامنے، اپنا دواخانہ کھولا تھا۔ 1965 میں وہ خیر پور منتقل ہو گئے اور وہاں اپنا ذاتی ہسپتال قائم کیا۔ اُس زمانے میں، ڈاکٹر قمر خیر پور میں واحد لیڈی گائنا کالوجسٹ تھیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان دونوں کی شہرت بحیثیت ڈاکٹر آس پاس پھیل گئی۔ ڈاکٹر تنویر، کالج یا یونیورسٹی میں پروفیسر بننا چاہتے تھے، لیکن بڑے بھائی عبدالنبی کی خواہش پر، انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ڈاکٹر تنویر کا پیشہ طب بہت متاثر ہوتا تھا۔ اگر وہ ایک دن کے لیے کسی کانفرنس میں شریک ہونے، شہر سے باہر جاتے تھے، تو مریض یہ سمجھتے تھے کہ شاید ڈاکٹر اب چار پانچ دن کے بعد ہی لوٹیں گے۔ علمی ادبی سرگرمیوں میں انہیں پی ایچ ڈی ڈاکٹر سمجھا جاتا تھا۔ ہسپتال میں سے آمدنی کا زیادہ حصہ ڈاکٹر قمر کی وجہ سے آتا تھا۔ تنویر اپنے پیشۂ طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور میڈیکل سائنس کے حوالے سے جدید تحقیقات کے بارے میں، اپنے مطالعے کو تازہ اور سیراب رکھا کرتے تھے۔

ازدواجی زندگی

تنویر عباسی کی پہلی شادی، ان کے والد کی خواہش پر روایتی انداز میں ہوئی۔ اس خاتون کا نام نور بی بی تھا۔ لیاقت میڈیکل کالج جام شورو میں، دورانِ تعلیم تنویر عباسی کا شعر و سخن سے بھی تعلق قائم رہا۔ وہ کالج کی ادبی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی کوششوں سے کالج میں "لطیف ڈے" منانے کی روایت رکھی گئی۔ ادبی سرگرمیوں کے دوران ڈاکٹر قمر قاضی سے ان کی دوستی ہوئی اور 1968 میں ڈاکٹر قمر قاضی سے دوسری شادی ہوئی ان کا نکاح مشہور عالم و ادیب مخدوم امیر احمد نے پڑھایا تھا۔ ان کی

شادی کی تقریب مشہور تھیا سافٹ ایپی یوسف کے نام سے منسوب، یوسف ہال حیدرآباد میں ہوئی۔
ڈاکٹر قمر قاضی (جو شادی کے بعد قمر تنویر بن گئیں) کی تنویر سے بہت قربت اور ہم آہنگی رہی۔ تنویر نے اپنے مجموعۂ کلام "شعر" کا انتساب ڈاکٹر قمر کے نام کیا تھا۔ سفرِ یورپ میں بھی ڈاکٹر قمر، تنویر عباسی کی ہم سفر ہیں۔ اس یادگار سفر کو تنویر نے "گھوم کے دیکھی دنیا" (ڈوري ڈوري ڏيھہ) کے نام سے قلم بند لیا تھا۔ اس منفرد، احساساتی و معلوماتی سفرنامے میں قمر تنویر کا ذکر بار بار آتا ہے۔ روم شہر میں جب قمر کے سائز کی جین نہ ملی تو تنویر نے ایک شعر کہا:

روم شہر میں
گھومتے، بھٹکتے تھک گئے ہم
ملی نہ لیکن جین قمر کی

"جب وہ اٹلی کے حسین ساحلی شہر نیپلس گئے تو بس اور لانچ میں Motion Sickness کی وجہ سے ڈاکٹر قمر کی طبیعت خراب ہوگئی تو وہ سیٹ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔ اس وقت ڈاکٹر تنویر بہت پریشان ہوئے اور اس پریشانی کا ذکر انہوں نے اپنے سفرنامے میں بھی کیا ہے کہ "ڈاکٹر قمر طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے حسین نظاروں کو دیکھنے سے محروم رہیں۔" اس کے بعد امریکہ، استنبول اور دبئی کے سفر میں بھی ڈاکٹر قمر تنویر عباسی کی ہم سفر رہیں۔ انہوں نے ساتھ مل کر حسین دنیا کے خوب صورت مناظر کا مشاہدہ کیا۔ ان سفرناموں میں تنویر نے جگہ جگہ ڈاکٹر قمر کا تذکرہ کیا ہے۔
تنویر کہتے ہیں:

> "ماضی کی یادوں کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا، بند نہیں ہوگا، کیونکہ میں میڈیکل کالج سے اپنا ماضی ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اُن سنہرے دنوں کے ساتھی کو میں نے اپنا جیون ساتھی بنالیا ہے۔ اندھیروں، بے انتہا مایوسی کی عمیق فضاؤں میں ہم دونوں نے مل کر امید کے دیپ جلائے ہیں۔ میں ماضی سے خالی ہاتھ نہیں آیا، وہاں سے ایک ایسی چیز ساتھ لایا ہوں جو میری ہے اور مرتے دم تک میرے ساتھ رہے گی۔ یہ الگ داستان ہے اگر "یادوں" کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ایسی اور کئی داستانیں لکھوں گا۔"

("ترورا"، تنویر عباسی، سوھنی پبلیکیشن، حیدرآباد، 1988، ص:137)

تنویر کہتے ہیں:

> "اگلا دن 13 جون تھا جو کہ قمر کا جنم دن ہے۔ قمر کے جنم دن سے ہمارے خاندان کی کئی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ 13 جون 1971 میں ہم اپنے گھر "سرد گھر" منتقل ہوئے۔ 13 جون 1979 میں ہمیں یورپ جانے کی

اجازت ملی۔ 13 جون 1986 میں قمر اور ہمارے بچے نیو یارک کے ایک ہوٹل میں اس کا جنم دن منا رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ 13 جون 1987 میں سرمد اپنی تعلیم کے لیے امریکہ روانہ ہوئے۔ میں خود ایک کیک لایا اور زبردستی اُن کے منہ میں ٹھونس دیا۔"

(تنویر عباسی"مجھے آگے جانا ہے۔امریکہ، یورپ اور دبئی کا سفرنامہ،

روشنی پبلی کیشن، کنڈیارو،ص:51)

اپنے ایک انٹر یو میں ایک سوال کے جواب میں تنویر عباسی نے کہا تھا:

" آپ شاعر ہیں، ادیب ہیں، شاعری، تحقیق، تخلیق، تنقید اور گھر کے لیے وقت کیسے نکالتے ہیں؟"

یوں سمجھ لیجیے کہ میری تین بیویاں ہیں ایک ادب دوسری قمر تیسری نور بی بی۔ اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادب کے ساتھ کبھی بھی ناانصافی نہیں ہوتی۔"

(زندہ لوگ ، انٹرویو: خالد اطہر)

اولاد

ڈاکٹر تنویر عباسی کی بڑی بیٹی کا نام روحی عباسی ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد ان کی شادی نجیب عباسی سے ہوئی۔

ان کی دوسری بیٹی کا نام پارس عباسی ہے جو Naspak Islamabad میں آکیٹیکٹ انجینئر ہیں۔ ڈاکٹر تنویر نے اپنی مشہور نظم "پارس" ان کی پیدائش پر لکھی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب "منهنجن تنين منتعل" "مشعل جن کے چہرے" اپنی اس پیاری بیٹی سے منسوب کی ہے۔ پارس شاعرہ ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ "ریشمی آواز چھپ چکا ہے اور اُن کی دوسری کتاب آنے والی ہے۔ ان کی شادی تنویر عباسی کی بہن نور جہاں کے بیٹے شاہد عباسی سے ہوئی ہے۔ پارس شاہد عباسی کے دو بیٹے ضمیر عباسی اور جانب عباسی ہیں۔

ڈاکٹر ماری ظہیر گھانگرو ڈاکٹر تنویر کی چھوٹی بیٹی ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم خیر پور اور انٹرمیڈیٹ سکھر سے کیا۔ انہوں نے ایم بی بی ایس DOW میڈیکل کالج کراچی سے کیا۔ ان کی شادی انجینئر ظہیر گھانگرو سے ہوئی۔ شادی کے بعد لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد میں استاد کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ آج کل لیاقت میڈیکل یونیورسٹی Comunity Medical میں پوسٹ گریجویشن کر رہی ہیں اور وہیں استاد کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ ان کے دو بیٹے رانول صدیق گھانگرو اور وشال صدیق گھانگرو ہیں۔ ڈاکٹر تنویر نے اپنی کتاب "ساجن سُونھن سُرت"، (ساجن، حسن، شعور) ماری اور

ان کے بچے رانول کے نام کی ہے۔

ڈاکٹر سرمد عباسی: تنویر عباسی کے بیٹے ہیں۔انہوں نے ابتدائی تعلیم خیر پور اور انٹرمیڈیٹ حیدرآباد سے کیا۔اُن کی باقی تعلیم بی۔اے سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی تک امریکہ میں ہوئی۔انہوں نے Computer Sciences میں P.H.D کی ڈگری لیتے وقت انہیں STANDINGOVATION ملا اور وہ Rutgers's university new jersey کے قابل فخر شاگرد مانے گئے۔ان کے کئی International Papers بھی چھپ چکے ہیں۔27 برس کی عمر میں P.H.D کرنے کے بعد وہ اپنے وطن پاکستان واپس آئے اور پاکستان میں وہ باوقار یونیورسٹیوں کے ساتھ منسلک رہے۔جن کے نام حسب ذیل ہیں:

QUID -E-AZAM UNIVERSITY, ISALMABAD.

GHULAM ISHAK KHAN INSTITUTE TOPI,ISLAMABAD.

FAST, LAHORE

.LUMS, LAHORE.

VIRYTUAL OPEN UNIVERSITY

قابل ذکر ہیں۔وہ Scientist ہیں اور Research میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اتنی مصروفیات کے باوجود خیر پور کو نہیں بھولے۔جون 2007 سے لے کر وہ پرائمری ٹیچرز کو ٹریننگ دینے کے لیے خیر پور آتے رہتے ہیں۔ممتاز ماہر تعلیم عبدالحمید لکھتے ہیں:

> ''برسوں بعد سائنس کے میدان میں سندھ سے ایک ستارا اُبھرا ہے۔سرمد نے تنویر عباسی کی منفرد وصیت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ جنگ کی گو کہ وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اس نئی تحریک کو جنم دیا جو انسانی ذات کی بھلائی کے لیے ہے۔تنویر عباسی نے اپنی کتاب ''بارانا بول''، ''بچوں کے بول'' اپنے بیٹے سرمد اور بیٹیوں کے مستقبل کے نام کی ہے۔اُس وقت سرمد صرف 6 سال کے تھے۔''

سرمد انسانی ذات کی ترقی کے حوالے سے لکھا:

> ''ہم کسی کی سرزمین پر قابض نہیں ہوں گے، ہماری آزادی کی لڑائی فتح کی ہوس پر ختم نہیں ہوگی۔وہ ساری انسانی ذات کی ترقی کے لیے ہمیشہ جاری رہے گی۔''

(بارس عباسی، ''ریشمي آواز'' ''ریشمی آواز'')

شخصیت

سچا اور مخلص دوست

تنویر عباسی کی شخصیت کا یہ سحر تھا کہ سینئر شعراء و ادباء سے لے کر نئے لکھنے والے تک، ہر کوئی دعویٰ کرتا تھا کہ تنویر ان کا دوست ہے۔ چناں چہ تنویر کے گرد محبت کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہمیشہ قائم رہا، ہم عصروں میں غلام ربانی آگرو، حمید سندھی، رشید بھٹی، شوکت جمانی، فتاح ملک ان سے بہت قریب تھے۔ تنویر کو اپنے دوستوں سے بہت پیار تھا یہاں تک کہ اگر دوستوں کے بارے میں انہیں کوئی شکایت ہو بھی جاتی تھی تو وہ کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔ غلام ربانی آگرو جب اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین تھے تو انہوں نے ایک مرتبہ تنویر عباسی کا نام چین کے دورہ پر جانے والے ادیبوں کے وفد میں شامل کر دیا، لیکن تنویر کی یہ خواہش تھی کہ ربانی صاحب بھی ان کے ساتھ وفد میں چلیں ورنہ وہ نہیں جائیں گے۔ اتفاق سے کسی بنا پر ربانی صاحب چین کے سفر پر جانے کے لیے رضامند نہیں ہوئے تو تنویر عباسی نے بھی چین جانے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ سے، ان کی دوستوں کے ساتھ محبت اور سچائی عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک کھرے اور مخلص دوست تھے۔

عجز و انکساری

تنویر عباسی ایک وسیع مطالعہ رکھنے والے شخص تھے۔ ان کے کتب خانے میں ادب، فلسفہ، سائنس، مذہب، تاریخ، منطق، موسیقی اور دیگر علوم و فنون کی بے شمار کتب موجود تھیں۔ جب وہ گفتگو کرتے تھے تو اس میں مختلف علوم کے حوالے برجستہ آتے تھے اور سننے والا ان کے وسعتِ مطالعہ کے سحر میں کھو جاتا تھا۔ وہ کوئی بھی بات حوالے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہر تقریر بامقصد اور فکر انگیز ہوتی تھی۔ مولانا رومی، حافظ، خیام، سعدی سے لے کر ایک نئے لکھنے والے تک سے وہ باخبر رہا کرتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عالم اور دانشور تھے۔ لیکن ان کے مزاج میں عاجزی و انکساری کے عناصر اس طرح کارفرما تھے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی سمجھتے رہے۔ نوجوان شاعر اختر درگاہی لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ ڈرتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ سائیں! آپ نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ قاضی قاضن میاں میر کا بھانجا تھا، لیکن وہ تو ان کا نواسہ تھا، تو انہوں نے (تنویر نے) فوراً کہا ہاں بھی یہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔''

اختر درگاہی مزید لکھتے ہیں:

''یہ اُن کا بڑا پن تھا، ورنہ وہ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ پروف کی غلطی تھی یا جو میں نے لکھا ہے وہ ہی درست ہے، جیسا کہ عام رواج ہوگیا ہے۔''

علمِ موسیقی سے رغبت

تنویر کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ لوک موسیقی ہو یا کلاسیکی اس کے بارے میں وہ اچھا خاصا علم رکھتے تھے۔ آڈیو کیسٹس کا ایک بڑا ذخیرہ ان کی آڈیو لائبریری میں موجود تھا۔ فن کاروں کی بڑی عزت کرتے اور راگ کی محفلوں میں انہیں غور سے سنتے اور داد دیتے تھے۔ خاص طور پر اُستاد منظور علی خان اور عابدہ پروین کو پسند کرتے تھے اور ان فن کاروں کے ساتھ، اُن کے اچھے مراسم بھی تھے۔ سچل سرمست کے سالانہ عرس کی تقریبات میں صوفی سماع کی محافل میں خصوصی طور پر شریک ہوتے تھے اور فن کاروں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

سچل چیئر، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی خیرپور میں تقرری کے دوران بھی انہوں نے سچل سرمست کے کلام کی آڈیو اور وڈیو کیسٹس، وہاں خاصی تعداد میں محفوظ کیں۔ مختلف مواقع پر وہ اپنی تقاریر میں اکثر یہ جملہ دُہراتے تھے کہ:

''جس انسان کے دل پر موسیقی اثر نہیں کرتی، اُس کے انسان ہونے میں شک کیا جاسکتا ہے۔''

تنویر عباسی کی خواہش تھی کہ شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی میں ''میوزک کا شعبہ'' قائم کیا جائے۔ اس حوالے سے نوجوان شاعر اختر درگاہی نے موسیقی کا نصاب بھی تیار کیا تھا، جسے تنویر نے پسند بھی کیا تھا، لیکن شعبۂ موسیقی یونیورسٹی میں قائم نہ ہوسکا۔

سیاسی وابستگی

بطور شخصیت تنویر عباسی سچی وابستگی رکھنے والے ایک مخلص انسان تھے۔ تنویر کے خاندان کے افراد چاہتے تھے کہ وہ پوسٹ گریجوئیشن کریں، لیکن اینٹی ون یونٹ تحریک میں عملی طور پر سرگرم عمل ہونے کی وجہ سے وہ مزید تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ انہوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا، اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

"جس وقت ون یونٹ کے قیام کی باتیں ہو رہی تھیں، اس وقت میں انٹر میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُس کے بعد 1955 میں ون یونٹ کے قیام کا یقین ہو گیا تو میں میڈیکل کالج کے پہلے سال میں تھا۔ پہلی تحریک ہم نے ون یونٹ کے خلاف "سندھ یوتھ فرنٹ" کے پلیٹ فارم سے چلائی، جس کے صدر ذوالفقار علی بھٹو تھے، جو اس وقت لندن سے لوٹے تھے اور کراچی میں وکالت کی ابتدا کی تھی۔ سندھ یوتھ فرنٹ میں جو دوسرے ساتھی شامل تھے ان میں مقبول بھٹی، حفیظ لاکھو (جو کچھ عرصہ اٹارنی جنرل بھی رہے ہیں) شیخ عبدالرحیم (جو ہلالِ پاکستان کے ایڈیٹر تھے) رشید بھٹی وغیرہ تھے۔ ون یونٹ قائم ہو گیا پھر ویسٹ پاکستان اسمبلی بنی۔"

(تنویر عباسی کی ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ. مہر خادم. ایم فل مقالہ. ۲۰۰۰ء. ص: ۸۳۵)

تنویر عباسی کا خیال تھا کہ ادیب کو سیاستدانوں کی فکری رہنمائی کرنی چاہیے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور سے متاثر ہو کر انہوں نے اُس میں شمولیت اختیار کی تھی۔

جی۔ ایم سید کی دعوت پر جب شیخ مجیب الرحمان کراچی آئے تھے تو اُس وقت شیخ ایاز نے عوامی لیگ میں شامل ہونے سے انکار کیا، بعد میں رشید بھٹی، فتاح ملک اور تنویر عباسی نے بھی عوامی لیگ کی ممبر شپ حاصل کی۔ انہوں نے جیل یاترا بھی کی اور سنٹرل جیل سکھر میں 28 اکتوبر 1979 کو یہ نظم لکھی تھی:

لوہے کی سلاخوں سے گزر کر
ہوا خوشبو لے کر آئی ہے
درد کے جنگل میں تیری میری
چاندنی لے کر آئی ہے
درد کی لمبی رات ہے تو کیا
چاند کھلا ہے اور مسکرا رہے ہیں ستارے
اور تیری یاد
بُھلا دیتی ہے درد سارے
مسکراتے رہے ہیں سدا دل والے
قید خانوں میں کہاں قید رہے ہیں ذہن
ہوا میں خیالوں کی خوشبو
پھیل جائے گی ہر سو
مہک جائے گی دیس کی ہر گلی

(یہ دھرتی، صفحہ: ۳۵)

شخصیت کا سحر

تنویر عباسی سے بچے، نوجوان، بزرگ سب یکساں انداز سے محبت کرتے تھے، بہت کم لوگ ہوں گے جنہیں تنویر سے کوئی شکایت رہی ہو۔ وہ مہمان نواز، محبت کرنے والے، ایک شفیق انسان تھے۔ جب کبھی بھی ادبی حلقوں میں یا شخصی سطح پر اختلافی مسائل پیدا ہوتے تھے، تو صلح تنویر عباسی ہی کراتے تھے اور سب اُن کے فیصلے کو قبول کرتے تھے۔ اُن کی دوستی کے حلقے میں نوجوان اور بزرگ یکساں طور پر شامل تھے۔ پیر حسام الدین راشدی، جی۔ ایم سید، شیخ عبدالمجید سندھی جیسی معتبر ہستیاں اُن کے ہاں مہمان ہوا کرتی تھیں، جن علمی و ادبی شخصیات سے دوستی کے مراسم تھے، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ غلام ربانی آگرو، رشید بھٹی، حمید سندھی، شوکت جمانی، شیخ ایاز ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ نیاز ہمایونی، الہداد بوھیو، امر جلیل، رسول بخش پلیجو، جمال رند، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو بھی ان کے دوستوں میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کے کئی نوجوان شاعر وادیب ان کے حلقۂ محبت وعقیدت میں شامل رہے ہیں۔ تنویر، اپنی ہردلعزیز شخصیت کی وجہ سے مختلف مکاتیبِ فکر کے لوگوں میں بھی قابلِ احترام تھے۔ جب انتقال سے دو ہفتے قبل انہوں نے اپنے بیٹے سرمد کے ساتھ رہنے کے لیے، خیر پور سے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا تو خیر پور، سکھر اور آس پاس کے ادبا و شعراء کافی رنجیدہ ہوئے تھے۔ اخبارات میں اپیلیں شائع ہوئیں جن میں تنویر عباسی سے، اسلام آباد جانے کا فیصلہ واپس لینے کی گزارشات کی گئی تھیں۔ تنویر عباسی ایک مخلص اور انسان دوست تھے۔ لوگوں کی اُن سے محبت کی وجہ، اُن کا پیار بھرا رویّہ تھا۔ ایک انٹرویو میں جب اُن سے کبھی نہ بھلا دینے والے کسی واقعے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا تھا:

> ''ایک مرتبہ ایک پیر صاحب مجھے گھر پر مریضہ دکھانے لے گئے۔ میں نے مریضہ کو دیکھا اور پیر صاحب کو بتایا کہ ''ان کا علاج ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد آپریشن کے ذریعے ممکن ہے۔'' پیر صاحب نے جوابا کہا ''ہم پردے دار لوگ ہیں۔'' میں نے کہا'' مرجائے گی۔'' وہ بولا'' مرجانے دو میں دوسری شادی کرلوں گا۔'' اس واقعے کو میں آج تک بھلا نہ پایا ہوں۔''

(ماھنامہ سوجھرو، کراچی، جنوری 76)

انٹرویو میں بیان کیے گئے اس واقعے سے تنویر عباسی کی حساسیت اور انسان دوستی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

خاندان کے افراد کی آراء

عبدالنبی عباسی

''میرا پیارا بھائی تنویر 25 نومبر 1999ء کو ہم سے روٹھ گیا، ہم اس جدائی کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تنویر کے ساتھ جو پل گذرے، اُن کو بھلانا بہت مشکل ہے۔ وہ جب بھی ملتا، مسکراتے ہوئے چہرے سے، نہایت ادب کے ساتھ میرا کہنا کبھی نہ ٹالتا، بس ایک بات اُس نے کبھی نہ مانی، وہ تھی سگریٹ نوشی چھوڑنے کی۔ ابتدائی دنوں میں، ایک دو سال کے وقفہ کے بعد، میں اُسے سگریٹ چھوڑنے کی گزارش کرتا تھا کہ بھائی، سگریٹ نوشی ترک کردو کہ یہ صحت کے لیے بہت مضر ہے۔

وہ مسکرا کر ہاں کہہ دیتا تھا، لیکن آخر دم تک اُس نے سگریٹ نوشی سے چھٹکارا حاصل نہ کیا بلکہ چین سموکر بن گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ سگریٹ نوشی کی کثرت نے اُس کی صحت کو بہت نقصان پہنچایا اور بالآخر ہمارا بھائی ہم سے بچھڑ گیا۔''

(مهران: تنویر عباسی نمبر، جنوری۔ جون 2000ء، ص 87)

نور جہاں عباسی

''بھائی تنویر کی شخصیت کے کئی روپ ہیں۔ ادیب، شاعر، محقق اور دانشور، لیکن میرے لیے ان کا سب سے اہم روپ ایک شفیق بھائی کا روپ ہے۔ وہ بچپن میں مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور آخر تک ان کے اُس پیار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وہ اپنے حصہ کی خوشیاں بھی، ہم بہنوں اور بھائیوں میں بانٹ دیتے

تھے۔ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود وہ ہم سے اور سب سے دوستوں کی طرح
ملتے تھے۔ بھائی تنویر کی یادیں اور باتیں بہت ہیں، کس کس کا ذکر کیا جائے۔
اُس میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں، خامی تو مجھے کوئی بھی نظر نہیں آئی۔ اتنے برس
بیت چکے ہیں، لیکن محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے بچھڑ گئے ہیں۔ سچ پوچھو تو
بھائی تنویر کی جدائی کا درد آج بھی دل میں تازہ ہے۔''

"پوان شل قبول" "کاش ہو جاؤں قبول"۔ ص15)

ڈاکٹر قمر تنویر

''تنویر خاوند سے زیادہ میرا دوست تھا، ایک ایسا دوست جو ہمیشہ میرے حقوق
کے لیے لڑا۔ اس نے میری رہنمائی کی اور پل پل میرا ساتھ دیا۔ سب سے
پائیدار رشتہ دوستی کا ہوتا ہے وہ جب ٹوٹتا ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ تنویر کے نہ ہونے کا
دکھ میں آج زیادہ محسوس کر رہی ہوں۔ ادب سے لگاؤ کا سبب بھی تنویر کی وجہ
سے ہے۔ میرے سارے بچوں کو ادب سے اُنسیت ہے۔ تنویر نے اپنی اولاد کو
بہتر سے بہتر تعلیم دی اور اُنہیں انسان دوستی اور روشن خیالی کا درس دیا اور آگے
بڑھنے کی تلقین کی۔ تنویر کی دی ہوئی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں میں شخصی آزادی
کے تصور نے جنم لیا اور آج وہ عملی زندگی میں شخصی آزادی کے قائل ہیں۔ زندگی
میں، جو بھی میں نے اچھے کام کیے ہیں، اُن کے پسِ منظر میں تنویر کی ہمت
افزائی شامل تھی۔ اُس نے مجھے بُرے بھلے کی تمیز سکھائی اور مجھے سفرِ زندگی کے
درست راستے بتائے۔ میں آپ سب کو مشورہ دوں گی کہ تنویر عباسی جیسے بن
جائیں، اپنی ذات کو بھلا کر دوسروں کی بھلائی کے لیے سوچیں۔''

(تقریر سے اقتباس)

ارشاد عباسی

''تنویر بہت دیالو آدمی تھا، ایک روپیہ مانگو تو دو دیتا تھا۔ کمزوروں سے پیار اُس
کی فطرت تھی۔ میں نے کبھی اُسے کسی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی
کی غیبت کرتے سُنا۔ بھائی عبدالغنی کے بعد وہ خاندان کا نفیس آدمی تھا۔ ایک

مرتبہ عید کے موقع پر، سب گھر والے میرے کپڑے لانا بھول گئے۔ والد اور والدہ نے یہ سوچا کہ گاؤں میں، والدین نے میرے کپڑوں کا بندوبست کر دیا ہوگا۔ عید کے روز صبح جب دوسروں کو نئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو دل بھر آیا اور میں رو پڑا۔ دل کی بات کسی کو بتائی بھی نہیں۔ تنویر نے دیکھ لیا اور گلے لگا کر رونے کا سبب معلوم کیا۔ جب میں نے بتایا کہ عید کے کپڑے نہیں ہیں تو ایکدم گاڑی کی چابیاں لے کر آیا اور کہنے لگا، چلو سکھر سے لے کر آتے ہیں۔ میری ذہنی اور ادبی تربیت و ترقی میں تنویر کا ہاتھ تھا۔ اگر تنویر ہمارے خاندان میں نہ ہوتا تو نہ الطاف عباسی کا اور نہ ہی میرا ادب کی طرف رجحان ہوتا۔ تنویر دوستوں کا دوست اور ایک سچا انسان تھا۔"

(مہران: تنویر عباسی نمبر، جنوری۔ جون 2000ء۔ ص 88)

پارس عباسی

"بابا سے میرا رشتہ نہایت جذباتی UnConditional اور ذرا مختلف سا ہے۔ بابا جب اسلام آباد آئے تو میں نے انہیں کچھ کمزور اور ناتواں محسوس کیا۔ میں نے سوچا کہ یہ کیفیت شاید ٹھنڈے موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ہے۔ میں شبِ عید بچوں کو لے کر بابا کے پاس گئی۔ ہم نے چھت پر پٹاخے چلانے کا سوچا، لیکن دھند اور سردی کی وجہ سے میں نے بابا کو نہیں بلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں بابا کو میں نے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے دیکھا۔ صرف میرے بچوں کی خوشی کی خاطر وہ اوپر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ہر پل، خوشیاں دیتے، خوشیاں لیتے اور خوش ہوتے ہوئے گزارا۔ میں نے ایک دم بابا سے کہا کہ یہاں بہت زیادہ سردی ہے آپ کیوں آئے، تو انہوں نے کہا تھا: "سمیر، جانب اور تیری خاطر۔" اُس وقت مجھے کیا پتہ کہ اُس گھر میں بابا سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ آج بھی دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ بابا ہم سے پھر کبھی نہ ملیں گے، کتنی بے بسی اور بے چارگی ہے۔"

(بھٹائی جرنل۔ تنویر عباسی نمبر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی۔ خیرپور 2000ء، ص 142)

معاصرین و ناقدین کی آراء

نیاز همایونی

''تنویر عباسی ہم سب کا بہت عزیز دوست تھا۔ چھوٹے قد کی وجہ سے ہم اُسے چھوٹا بھائی سمجھتے تھے، لیکن ادبی حوالے سے وہ قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ تنویر، خیر پور سے کیا گئے، دنیا ہی سے چلے گئے۔ اُس کی باتیں ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہ ایک میٹھا اور پیارا انسان تھا اور اس کے لواحقین بھی شہد اور مصری سے کم نہیں ہیں۔ ہماری بھابھی قمر ہو، ارشاد النبی ہو، پارس مارئی یا سرمد ہو، سب تنویر عباسی جیسے ہیں لگتے ہیں۔''

(مهران تنویر عباسی نمبر2000، ص201)

غلام ربانی آگرو

''بہت سی مجبوریوں کے باوجود تنویر عباسی نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ وہ ایک لائق انسان تھے، یہ والدین کا فرمانبردار بیٹا تھا اور اپنی اولاد کا شفیق باپ تھا۔ جاہلوں سے ہمیشہ دور رہا کرتا تھا۔ انفرادی زندگی میں اس نے کسی سے دغا نہیں کی۔ عزیزوں اور دوستوں سے تادمِ مرگ ساتھ نبھایا۔ اجتماعی زندگی میں سندھ کی مٹی اور لوگوں سے پیار کیا اور ان کے ہاں عزت اور بلند مقام حاصل کیا۔ اُس نے اپنی زندگی صاف ستھری اور اہلِ دل انسان کی طرح بسر کی۔ کسی قسم کی سیاہی سے اپنا دامن داغ دار نہ کیا۔ وہ سندھ کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن مثال چھوڑ گئے۔''

(مهران تنویر عباسی نمبر2000،۔ ص97)

امر جلیل

''خیر پور شہر کو میں، اس لیے اہم سمجھتا ہوں کہ وہاں تنویر عباسی رہائش پذیر ہیں جو سندھی ادب کا اہم، بڑا اور تازہ فکر رکھنے والا شاعر ہے، نئی روایات کا خالق ہے۔اُن کے ملنے کا اندازہ بھی اتنا پیار بھرا کہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ سندھی ادب کا اہم اور مشہور شاعر ہے۔''

غلام حسین رنگریز

''سندھی زبان وادب کی دنیا کا، صوفی مزاج، سچا انسان، صلح پسند، وطن دوست اور انسان پرست تنویر عباسی، نہ صرف ایک اچھا شاعر، نقاد اور محقق تھا بلکہ وہ اپنے وجود میں ایک ادارہ تھا، جس نے کئی نوجوانوں کی رہنمائی کی اور تمام زندگی جدید سندھی ادب کی ترقی کے لیے کوشاں رہا۔وہ کس خاموش لہر کی مانند تھا جو پہاڑوں اور میدانوں سے گزرتی، سرمدی نغمات گاتی، پیاسی دھرتی کی پیاس بجھاتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔''

ایاز گل

''تنویر عباسی آج کے دور کی تاریخ ہیں، زندہ اور روشن تاریخ۔جن کی شخصیت کے تمام پہلو سورج کی طرح روشن اور واضح ہیں۔وقت اُن کے آگے سدا غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔شاعر، ادیب، محقق، نقاد، سفرنامہ نگار اور دانشور۔سارے روپ بھرپور اور مکمل۔شفقت اور محبت کی مٹی سے بنے تنویر عباسی، جن کو میں نے اپنے لیے ہمیشہ ٹھنڈی چھاؤں کی طرح سمجھا ہے۔برگد کی ٹھنڈی چھاؤں جیسی شخصیت، جو سب کا بانہیں کھول کر استقبال کرتی ہے، جس کا وجود ہمت اور عزت افزائی کی علامت ہے۔میں نے اپنے ۳۵ برس کے تخلیقی سفر میں تنویر جیسے محبت کرنے والے لوگ، اُن کے ہم عصروں میں بہت ہی کم دیکھے ہوں گے۔اس نئی نسل سے بہت محبت تھی۔وہ ہر ایک کی ہمت افزائی اور

قدر افزائی کرتے رہتے تھے جیسے ہر ایک کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہوں، بلکہ انہیں خود سے بھی آگے نکل جانے کا حوصلہ دیا کرتے تھے۔ جواب میں نئی نسل سے انہیں احترام و عقیدت بھی زیادہ ملی۔ بڑا ادیب ہونا بھی اچھی بات ہے لیکن بڑا انسان ہونا اُس سے بھی بڑی بات ہے۔ تنویر عباسی میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ جس کے لیے کیا کہنا۔"

(مهران تنوير عباسي نمبر 2000/1، سنڌي ادبي بورڊ. ڄام شورو. ص174)

شاعری

پہلا شعر

تنویر عباسی کا پہلا شعر 16 برس کی عمر میں، حیدر آباد سے جاری ہونے والے مخزن "فن کار" میں 1950ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مخزن کے ایڈیٹر عنایت اللہ عباسی تھے۔

مغموم سے تنویر تک

شعروسخن کے ابتدائی ایام میں، تنویر بزمِ خلیل میں علمِ عروض کی تعلیم لیا کرتے تھے اور جمعیت الشعراء کے طرزِ سخن پر اشعار کہتے تھے۔ اس وقت وہ اپنا تخلص "مغموم" استعمال کرتے تھے۔ اُسی زمانے کی شاعری کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "میں نے محسوس کیا کہ وہ شاعری صرف غزل تک محدود تھی اور غزل بھی ایسی جس میں ایک ہی جیسے الفاظ، تراکیب اور خیالات بار بار دھرائے جاتے تھے۔ اردو شاعری کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ پچاسوں دیوان پڑھتے جاؤ تو سب میں ایک ہی بات، ایک جیسے خیالات ملیں گے۔ اسی طرح جب فارسی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ جو شعری روایات صدیوں سے فارسی شاعری میں ختم ہو چکی ہیں وہ اردو اور سندھی میں اب نمودار ہو رہی ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس اجرک اور پگڑی والے مجبور اور مفلس لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ ان سے بھی کوئی رشتہ ہے۔ جب تک اُن کے دکھوں کو اُن کی ہی زبان میں نہیں بیان کیا جاتا، تب تک مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہ وہ باتیں تھیں، جنھوں نے مجھے مغموم سے تنویر بنایا۔"

(انٹرویو ماھنامہ سوجھرو، کراچی۔ جنوری 1974ء)

اسی طرح تنویر نے روایتی انداز سے ہٹ کر سماج سے وابستگی کا احساس رکھتے ہوئے، نئے فکری زاویوں کو اختیار کرتے ہوئے تخلیقی جوہر کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ چناں چہ ان کا کلام آج بھی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ کسی کے پیچھے چلنے کی بجائے انہوں نے اپنا راستہ خود بنایا ہے۔

نئی نسل کا رھنما

ماضی قریب میں جنریشن گیپ کے حوالے سے کافی بحث مباحثے ہوتے رہے ہیں اور بزرگ ادباء اور نئی نسل کے لکھنے والے اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے رویوں اور تصورات میں اختلاف بلکہ تضادات کی شکایات کرتے رہے ہیں۔ جس کی ایک وجہ آپس میں میل جول کی کمی اور ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا بھی ہو سکتی ہے۔ نئی نسل کے کچھ لکھاریوں کی رائے ہے کہ ہمارے بزرگ ادیب و شعراء ہمیشہ ماضی کے سحر میں گم رہتے ہیں اور موقع بے موقع محض اپنے ہی کارناموں کے گن گاتے رہتے ہیں اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا تو بڑی بات ہے ان کے خیالات و تصورات جاننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ تحقیق اور علمی برتری کا اظہار فخریہ انداز میں کرتے ہیں اور نوجوانوں کے لیے ان کے پاس تنقید اور تنقیص کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض سینئر ادباء بھی نوجوان لکھنے والوں کی اُسی انداز میں شکایات کرتے ہیں کہ وہ مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ شہرت حاصل کرنے کے آسان راستے تلاش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایات کے ایسے ماحول میں چند ادیب و شاعر ایسے بھی ہیں، جنھیں نوجوانوں کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے اور وہ ان کی صلاحیتوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے سماجی تناظر کے ساتھ ادب کی جمالیاتی قدروں کی تبدیلی کے بھی قائل ہیں۔ ایسی شخصیات میں تنویر عباسی کا نام سرِفہرست ہے۔ تنویر کی شخصیت میں نوجوانوں کے لیے اپنائیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب وہ خود نوجوان تھے تو ان کو پیر حسام الدین راشدی اور غلام محمد گرامی جیسی شخصیات کی رفاقت حاصل ہوئی تھی اور ان بزرگوں نے تنویر کو کبھی بھی اپنی برتری کا احساس نہ ہونے دیا تھا بلکہ وہ تنویر کو اپنا دوست ہی سمجھتے رہے تھے۔ اسی حوالہ سے تنویر عباسی لکھتے ہیں:

> ''اور پھر پیر صاحب اور ہمارے درمیان عمر کا فرق ختم ہوگیا۔ ہم اگر آپس میں چھیڑ چھاڑ اور مذاق وغیرہ کرتے تھے تو پیر حسام الدین ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہماری طرح، ہم جیسے ہیں۔''

(حواله: مشعل جهن جن کے)

بزرگ ادیبوں سے دوستی اور اپنائیت کا اثر تھا کہ تنویر عباسی عمر کے آخری ایام تک نئی نسل کے ہم راہ تھا، بالکل اُن جیسا۔ اُسے نہ کوئی برتری کا احساس تھا اور نہ بزرگی کا گھمنڈ۔ اس کا دل صرف دوستی کے خیال سے پرنور تھا۔ عملی زندگی میں بھی وہی انداز اور تخلیقات میں بھی ویسا ہی اظہار۔ اس کے مزاج میں فکر و عمل اور اظہار و احساس میں کوئی تضاد تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی نئی نسل سے پیار کرتا اور ہمیشہ ان کے مستقبل کی فکر میں غلطاں رہتا تھا۔

ایک لکھاری جہاں اپنی تخلیقات کی وجہ سے عام لوگوں تک، اپنی فکری شناخت کرواتا ہے، وہیں اس کی زندگی کے عملی پہلو اور رویے بھی مجموعی طور پر زیرِ غور رہا کرتے ہیں۔ یہ ادب کا ایک بحث طلب موضوع رہا ہے کہ کسی شاعر کو صرف اُس کی تخلیقات کے آئینے میں دیکھا جانا چاہیے، یا اُس کی شخصیت کے تاثر کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ ان دونوں حوالوں کو آپس میں جوڑ کر ہم جب تنویر عباسی کی تخلیقات اور اس کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں ایک متوازن شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ''رگیں ہوئیں رباب'' (رڳون ٿيون رباب) سے لے کر ساجن، حسن، شعور (ساجن، سونهن، سُرت) تک اپنے شعری سفر میں جہاں وہ ہمیں واضح طور پر امن اور پیار کے مبلّغ، حسن و سادگی کے متلاشی، سچے تخلیق کار نظر آتے ہیں، وہیں عملی زندگی میں ایک آدرشی، بُردبار، متوازن طبع، تحمل مزاج، مثالی انسان اور دوست بھی محسوس ہوتا ہے۔ ایک مشہور اور مقبول شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی اپنی ذاتی برتری کے خبط میں مبتلا نہ ہوئے اور نہ ہی انہوں نے کبھی خود ستائشی اور نمائشی انداز کو پسند کیا۔

تنویر عباسی نے انفرادی انا پرستی سے دور رہ کر ہمیشہ اجتماعیت کا درس دیا ہے اور کہا:

آؤ ساتھیو
مل بیٹھیں
گر مریں تو ساتھ مریں
گر جیئیں تو ساتھ جیئیں
کچھ کریں
اور جو بھی کریں
تو ساتھ کریں

(حوالہ: بہ دھرتی ص55)

اجتماعیت کے اسی تصور کے زیرِ اثر تنویر عباسی کا نئی نسل پر بھروسہ اور یقین ہمیشہ قائم رہا ہے۔ وہ اکثر نئی نسل کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ وہ ماضی کی اہمیت سے منکر نہ تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ صرف ماضی کے حوالے سے زندہ رہنے والے افراد، اپنے مستقبل کو تابناک نہیں بنا سکتے، اس لیے ماضی سے سبق سیکھتے ہوئے حال میں جدوجہد کرنی چاہیے اور آنے والے وقت کے لیے منصوبہ بندی کے تحت تدابیر اختیار کرتے رہنا چاہیے۔

ماضی پہ فخر کرتے ہو
حال میں کیسے ہو؟

(حوالہ: بہ دھرتی ص22)

اس اظہار کے بعد تنویر عباسی مزید کہتے ہیں:

میرا بیٹا
اور میری بیٹیاں
مجھے سہارا دے کر
مستقبل کی طرف
لے جا رہے ہیں

(حوالہ: یہ دھرتی۔ ص48)

وقت کی گراں بار زنجیر اتار پھینکنے کے بعد شاعر کا فکری محرک ذات سے لے کر کائنات تک پھیل جاتا ہے۔ ذاتی تجربات اور داخلی احساسات سے شروع ہو کر اس کے فکری دائرے اجتماعیت تک پھیل جاتے ہیں۔ اسی طرح اُس کی داخلی کیفیات قاری کے دل کی ترجمانی کرتی ہیں اور ایک فرد کی محسوسات، اجتماعی فکری اثاثہ بن جاتی ہیں۔ تنویر عباسی کے نئی نسل کو منسوب کردہ خیالات، اُن کی ذات سے سفر کرتے ہوئے، پوری انسانیت تک رسائی کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے "سرمد" اور اپنی بیٹیوں "پارس" اور "ماروی" کے ذریعہ سندھ کی نئی نسل سے مخاطب ہوتا ہے۔ وہ نئی نسل کے ساتھ چلنا پسند کرتا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ آنے والی نسل، اُس کی با مقصد جدوجہد کو آگے تک لے جائے گی۔ وہ نئی نسل کو اپنے سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔

میں تو ماضی ہوں
وہ مستقبل ہوگا
میرے جیون کے مقصد کو
مجھ سے آگے لے جائے گا
میرا ساجن آئے گا

"ساجن سُونھن سُرت"، (ساجن، حسن، شعور)۔ ص:34)

ان سطور میں تنویر عباسی نے اپنے بیٹے سرمد کو بطور علامت "ساجن" لکھا ہے، جو پوری نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ تنویر نے اُس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے، اس اُمید کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس دھرتی کے روشن مستقبل کی ضمانت بنے گا۔ وہ اپنے اشعار میں جہاں کہیں بھی سرمد سے مخاطب ہوئے ہیں تو ان کے تصور میں دراصل پوری نئی نسل رہی ہے جو کہ آنے والے کل کی وارث بنے گی۔

تم سدا ہی جیو
گلابی پھول کی طرح
تم سدا ہی کھلو

میں ہوں ناتواں

تم ہو جواں

اور مجھ سے بڑا

بوجھ دھرتی کا سارا ہے

تجھ پہ پڑا

تم اُٹھا کر اُسے

آگے بڑھتے ہوئے

کل کی روشن صبح تک

پہنچ ہی سکو

تم سدا ہی جیو

''ساجن سُونہن سُرت''،(ساجن،حسن،شعور)۔ص:103)

نئی نسل کی صلاحیتوں کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے کہ تنویر خود کو ناتواں کہتے ہوئے، اُن کو خود سے بڑا جانتے ہیں اور وطن کی خوش حالی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ان کی ترقی اپنے لیے حقیقی راحت جانتے ہیں۔ایک بڑے شاعر کے روپ میں تنویر عباسی نے،نئی نسل کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کے اوپر نثار ہونے کی آرزو کی ہے،وہ ان کے بڑے شاعر اور بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے۔

تیرے مرنے سے پہلے

میں خود مروں

سندھ کی نئی نسل

تجھ پہ قربان ہوں

مجھ کو راحت ملے

گر تم بڑھو

میں مروں تم جیو

میں مروں تم جیو

''ساجن سُونہن سُرت''،(ساجن،حسن،شعور)۔ص:104)

تنویر عباسی کے سیاسی نظریات و خیالات عوام دوستی سے وابستہ تھے اور انہوں نے کبھی بھی،سیاسی و سماجی مسائل کو جذباتی انداز میں،اپنی شاعری میں بیان نہیں کیا۔وہ اپنے فنی اظہار میں ایک آرٹسٹ ہی رہے۔دھرتی اور زبان سے ان کی وابستگی میں،سچائی،خلوص،محبت بھی ہے اور درد بھی۔یہی سبب ہے کہ نئی نسل کے لیے ان کے بیان کردہ احساسات،میں پر خلوص سادگی اور بے ساختگی عیاں ہے۔جس میں

کسی قسم کا تصنع، بناوٹ اور لفاظی نہیں۔ ان کی یہ بے ساختہ سچائی پڑھنے والے کے من کو چھو لیتی ہے۔

جس طرح تنویر نے نئی نسل کو اپنے اشعار میں سراہا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی تعریف کی ہے اُسی طرح عام زندگی میں بھی اُن کا برتاؤ نوجوانوں کے ساتھ، اپنائیت بھرا رہا۔ انہوں نے کبھی بھی نوجوانوں پر اپنی علمی قابلیت اور سماجی برتری کا رُعب نہیں جھاڑا تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اس کی علمی بصیرت کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر نوجوان تنویر کو اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتا تھا اور ان سے گفت گو کرتے وقت احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ وہ نوجوانوں کو غور سے سنتے تھے۔ جیسے وہ اُن نوجوانوں سے کچھ سیکھنا یا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

ہمارے کئی بزرگ ادیب، شاعر و دانشور صدارت یا مہمانِ خصوصی کی کرسی کے بغیر کسی ادبی پروگرام میں شرکت کو اپنی اہانت تصور کرتے ہیں اور یہ معاملات پہلے سے ہی میزبان سے طے کر لیتے ہیں لیکن تنویر عباسی میں یہ خوبی تھی کہ وہ نئے لکھنے والے نوجوانوں کی زیرِ صدارت پروگراموں میں بخوشی شریک ہوتے تھے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ تلقین کرتے تھے کہ نوجوانوں کو آگے لایا جائے اور ادبی نشستوں کی صدارتیں ان کو دی جائیں۔ وہ کسی ایسے پروگرام میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے تھے جس میں انہیں صدارت کے لیے کہا گیا ہو۔ تنویر اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اُنھیں اپنے ساتھ ادبی شام کا پروگرام بہت کم قبول ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح اپنی کسی کتاب کی تقریب رونمائی کا پروگرام بھی انھوں نے کبھی منظور نہ کیا۔

تنویر عباسی اپنی شخصیت اور فکر میں ہمیشہ اُمید پرست رہے ہیں۔ یاسیت اور نااُمیدی کبھی ان کے قریب نہ آئی۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک سنجیدہ سی پُرکشش مسکراہٹ روشن رہی ہے اور عمر رسیدگی کے باوجود وہ زندگی سے کبھی بیزار اور مایوس نہ ہوئے۔ ان کی یہی وہ طمانیتِ قلب تھی جو اُن کی شاعری میں ایک بنیادی قدر کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔

احتجاج اور مزاحمت

دھرتی پہ جہاں کہیں بھی ناانصافی اور جبر کی گھٹن بڑھتی ہے تو وہاں سیاسی، سماجی و ادبی محاذوں پر احتجاجی و مزاحمتی رویہ زور پکڑتا ہے۔ سماجی ناانصافی کے کئی روپ ہو سکتے ہیں۔ معاشی استحصال سے لے کر ثقافتی استحصال تک جبر کی کئی مثالیں ہیں۔ ہر دور کے فرعونوں اور سچائی کے علم برداروں نے، اپنے دور کے فرعونوں اور یزیدوں کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ اس قسم کی مزاحمت علمی و عملی دونوں سطحوں پر ہوئی ہے۔ ایسپ کی علامتی کہانیاں، اپنے دور کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف علمی احتجاج اور مزاحمت کی

مثال ہیں۔ جبکہ حضرت حسینؓ کی یزید وقت کے خلاف مزاحمت، عملی مزاحمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ سندھی شاعری میں دوسری زبانوں کے ادب کی نسبتاً، احتجاج اور مزاحمت کا عنصر، زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ سندھی لوک ادب میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو کہ اپنے دور کے مزاحمتی رویوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ شاہ لطیفؒ کے ''سُر کیڈارو'' کی فکر سے لے کر، خلیفہ نبی بخش قاسم کے، رزمیہ سُر کیڈارو تک سندھی شاعری میں مزاحمت اور احتجاج کے منفرد رنگ نظر آتے ہیں۔ سندھ کے معروضی حالات بھی، ماضی سے بہت زیادہ مختلف نہیں رہے ہیں۔ اس لیے مزاحمت اور احتجاج کا یہ سلسلہ ایک تسلسل کے ساتھ سندھی شاعری میں کسی نہ کسی انداز میں ہر دور میں موجود رہا ہے۔ شیخ ایاز کی نظم 'سنگرام' میں جنگی جنونی رویوں کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا، کیونکہ قیامِ امن کے لیے لازمی ہے کہ جنونیت کے خلاف مزاحمت کی جائے فکری محاذ پر کی گئی اس مزاحمت کی پاداش میں شیخ ایاز کو 7 مئی 1971ء سے 31 دسمبر 1971ء تک قید و بند کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ اس سلسلے میں طارق اشرف کے رسالے ''سوجھری'' میں لکھے گئے ایڈیٹوریل مزاحمت اور احتجاج کا قابلِ فخر ریکارڈ پیش کرتے ہیں جن کی پاداش میں طارق اشرف کو کئی مرتبہ جیل جانا پڑا تھا۔ 'روح رهاڻ' ''مخزن کا مزاحمتی کردار بھی قابلِ تعریف رہا ہے، جس نے ادبی اور ثقافتی مورچے پر سندھی زبان کو فکر انگیز احتجاج و مزاحمتی ادب سے مالا مال کیا ہے۔

سندھی زبان و ادب جب مشکل حالات میں تھے تو اس کے شاعر و ادیب، علمی و عملی دونوں محاذوں پر لڑ رہے تھے اور اس جہاد میں تنویر عباسی صفِ اول میں شامل تھے۔ جب شریف کمیشن کے ذریعے سندھی زبان کی حیثیت ختم کر کے اُس کی پہچان ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو سندھی دانشوروں ادیبوں اور شاعروں نے سندھی ادبی سنگت کے پلیٹ فارم پر متحد ہو کر، صدائے احتجاج بلند کی۔ اس سلسلے میں 14 اکتوبر 1962ء کو جامعہ عربیہ ہال، تلک چاڑھی حیدر آباد میں سندھ سنگت ڈیلیگیٹ کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس کی صدارت نامور ادیب محمد عثمان ڈیپلائی نے کی تھی۔ اس موقعہ پر ''یوم سندھی زبان'' منانے کی تجویز منظور کی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سارے سندھ کا دورہ کر کے ایک احتجاجی تحریک چلائی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے ایک تین رُکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں، شمشیر الحیدری اور ناصر مورائی کے ساتھ تنویر عباسی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ تنویر عباسی عملی محاذ پر بھی متحرک رہے اور علمی و فکری محاذ پر بھی اپنی احتجاجی شاعری کے ذریعے نہایت بھر پور کردار اور اس تحریک میں سندھی زبان کا ترانہ تخلیق کرنے کا اعزاز بھی تنویر عباسی ہی کو حاصل ہوا۔ تنویر کا لکھا ہوا سندھی زبان کا ترانہ، جب 9 نومبر 1962ء کو ''یومِ سندھی زبان'' کے موقعہ پر مشہور عوامی گلوکار فقیر عبدالغفور نے اپنی سُریلی آواز میں گایا تو وہاں موجود عوام میں اپنی زبان سے محبت کا ایک نیا جذبہ بیدار ہوا۔ سندھی زبان کی تحریک میں تنویر کا ترانہ نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس قومی احساس کے باوجود سندھ کے روشن

خیال ادیبوں اور شاعروں نے کبھی بھی زبان کی بنیاد پر تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔ ویسے بھی زبانیں باہمی تعلق کا ذریعہ ہوتی ہیں اور ان کے نام پر نفاق کو غیر مہذب عمل ہی سمجھا جاتا ہے۔ تنویر عباسی جیسے نفیس اور صوفی شاعر جس نے ہمیشہ سب کی بھلائی چاہی اور اپنی زبان سے اس کی محبت کے اشعار، کسی کے خلاف کبھی بھی نفرت کا سبب نہ بنے۔ جب اس کی زبان و ادب کے مرکز سندھیالوجی کو کچھ شر پسندوں نے آگ لگادی تو ان کا دل تڑپ اُٹھا۔

''جلتا رسالا دیکھ کر، لطیف مسکرایا''

سندھالاجی کی راکھ سے ایک نئی پُروقار سندھالاجی بن گئی۔ سندھی زبان کی تحریک کامیاب ہوئی۔ جس میں سب کی اجتماعی کاوشیں شامل تھیں۔ سندھی زبان کے سوال پر سب متفق تھے۔ اس تحریک میں کوئی بھی فرد عظیم نہ تھا، صرف سندھی زبان عظیم تھی۔ تنویر عباسی بھی اجتماعیت کا قائل تھا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اتحاد اور یک جہتی کے بغیر کوئی بھی احتجاج کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس نے کہا:

گر جئیں تو ساتھ جئیں

گر مریں تو ساتھ مریں

کچھ کریں

اور جو کریں تو ساتھ کریں

اجتماعیت کے ساتھ ساتھ، ارادے کے مضبوطی بھی ضروری ہے اور کسی مصلحت پسندی کا شکار بھی نہ ہوتا ہے۔ مقصد کے رستے میں زندگی کی اہمیت نہیں رہتی۔ جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے ارادہ پہ اٹل رہنا ہے۔ گردن کسی کے آگے جھکانی نہیں چاہیے۔ اس سے بہتر ہے کہ پھر سر ہی کٹایا جائے۔

ایسے اعلیٰ اور اُتم خیالات، ایک آدرشی اور اپنی دھرتی سے سچی وابستگی رکھنے والا شاعر ہی تخلیق کرسکتا ہے۔ ایسا شاعر جس کی خوشیاں و غم، اپنے عوام کے ساتھ وابستہ ہوں اور وہ عوام کے دکھ اپنے دکھ سمجھتا ہو۔ 4 مارچ سندھ کی تاریخ میں طلبہ کی مزاحمت کی تاریخ ہے۔ تنویر نے اپنی شاعری میں احتجاج و مزاحمت کی اس لہر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے۔

تنویر عباسی کے کافی اشعار کسی مخصوص واقعے کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن فنی اور فکری حوالوں سے ان کی افادیت ہر دور میں محسوس کی جائے گی۔ وطن دوستی سے لے کر انسان دوستی تک ان کے خیالات میں فکری وسعت ہے۔ وہ کسی مخصوص مسلک، نظریے یا منشور کا پرچارک نہیں ہے۔ اُس کا بس ایک ہی منشور ''انسانیت'' ہے۔

تنویر عباسی کا مزاحمتی انداز، سطحی نعرے بازی سے بہت دور نظر آتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ احتجاج یا مزاحمت کا عمل صرف جھنڈے اور نعرے بازی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زیادہ سنجیدہ فکر اور رویے کی متقاضی

ہے۔ بلکہ زندگی کے مختلف معاملات میں اپنے شخصی رویہ سے بھی مزاحمت کی جا سکتی ہے۔ بلوچ ادیب، پروفیسر عبداللہ جمالدینی اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ بلوچی ادب پر میرا ایک ریڈیو اسکرپٹ تھا۔ جب میں نے وہ پروڈیوسر کے حوالے کیا، تو اُس نے مجھ سے کہا کہ میں، اسکرپٹ شیر محمد مری اور گل خان نصیر کے نام نکال دوں۔ میں نے کہا، اگر بلوچی ادب سے گل خان نصیر اور شیر محمد مری کے نام نکال دیں تو پھر کیا بچے گا، اور پھر میں نے وہ پروگرام نہیں کیا۔"

شاعر و ادیب اپنے اشعار اور تحریروں میں احتجاج کا رنگ تو بھرتے ہی ہیں لیکن وہ عبداللہ جان جمالدینی کی طرح وقتی مصلحت پسندی سے بالاتر ہو کر ہی اپنا احتجاجی رویہ ریکارڈ کروا سکتے ہیں۔

روایات اور کلاسیکی علامات

جدید ادب بھی روایات کا ہی تسلسل ہے اور یہ عمل یوں ہی جاری رہے گا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی بھی فن پارہ اپنے اندر زندہ رہنے کی کتنی قوت رکھتا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی شاعری اپنے فکری جوہر میں آج بھی بھرپور طاقت رکھتی ہے اور اُس کی افادیت کل کی طرح محسوس کی جاتی ہے۔ آج جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے، اگر اس میں فکری و فنی قوت اور آرٹ کی گہرائی موجود ہے تو وہ روایت کا حصہ بن جائے گی۔ بصورتِ دیگر وہ اپنی پہچان کھو دے گی۔

تنویر عباسی کی شاعری بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنی کلاسیکی روایات سے جڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے ماضی کے ادبی ورثہ کو، سنبھالتے ہوئے ان علامات کو نئے زاویوں سے اپنی شاعری میں منتقل کیا ہے۔ تنویر نے شاہ لطیفؒ کی شاعری کے کرداروں سسی، سوہنی، ماروی اور بیجل کو علامتی طور پر اپنے کلام میں شامل کرتے ہوئے عصری حالات کے پیش نظر اپنے افکار بیان کیے ہیں۔ ون یونٹ کا دور تھا۔ سندھ اور سندھی زبان کے لیے بہت مشکل حالات تھے اور تنویر عباسی نے اس وقت کی حرارت کو خود بھی محسوس کیا تھا اور ان مراحل سے گزرے بھی تھے۔

شاہ لطیفؒ کی سورمی سسی، جدوجہد کی علامت ہے۔ اُس کردار کی جفاکشی کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ، فرد کو ویسے بھی مرنا ہے، کیوں نہ تلاشِ محبوب (حق) میں فنا ہو جائے۔ تنویر سسی سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

سسی!

تمہارا سہاگ جنوں

تمہارے دیور تم سے چھین کر لے گئے
مجھے سچ بتاؤ کہ
میری سندھڑی کو
کون اٹھا کر لے گیا ہے
میرے پاؤں میں زنجیریں ہیں
اور میری آواز
میز پر رکھی ہوئی ان تحریروں میں ہے

"رگیں ہوئیں رباب" (رگیوں تیوں رباب) ۔ ص ۔ 37)

سوہنی کا کردار مرّوج سماجی اقدار، جس میں مرد کو خود ساختہ معتبر درجہ حاصل ہے، کے خلاف بغاوت کی علامت ہے۔ شاہ لطیف ؒ عورت کی مساوی حیثیت کے قائل تھے۔ اور سوہنی کا جراَت مندانہ کردار، سماج کی ڈری اور سہمی ہوئی عورت کو آوازِ حق عطا کرتا ہے۔ تنویر عباسی نے سوہنی کی راہِ عشق میں فنا ہونے والی قربانی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُسے اپنے احساسات کی علامت بناتے ہیں۔ تنویر عباسی کے وہ احساسات وافکار مجموعی طور پر اپنی دھرتی کے حوالے سے ہیں:

سوھنی!

آج مہران کی موجوں سے جھانکو
اور مجھ پریشاں حال کی داستان سُنو
تم نے محبت کی خاطر
اپنی جان کی پرواہ نہ کی
میں بھی الفت کے لیے
اپنا سر قربان کرنے کو تیار ہوں
تم بھی سوہنی
میں بھی سوہنی
دونوں عشق پہ قربان ہیں
آؤ مل کر سندھڑی کو
اپنی جاں کا نذرانہ دیں

"رگیں ہوئیں رباب" (رگیوں تیوں رباب) ص ۔ 38)

'بیجل' سندھ کا موسیقار ہے جو ایک ساز "سُرندو" ایجاد کرتا ہے اور اُسی ساز کے سحر میں رائے ڈیاچ کو مبتلا کر کے اپنے فن کی داد میں اُس کا سَر مانگتا ہے اور سُر کا عاشق رائے ڈیاچ بخوشی اپنا سر بیجل کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایسی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملتی ہو۔ تنویر عباسی اُسی موسیقار بیجل کو علامت بنا کر ون یونٹ مخالف تحریک میں اپنے خیالات اس طرح بیان کرتے ہیں:

بیجل!

پھر تم اپنا وہی ساز لے کر آؤ
جو تن من کو آگ لگا دے
تم نغمات کے دریا ہو
آج روح میں آگ لگانے کی تمنا ہے
ساز کی آواز سے
سارے دیس کو ہلا دے

"رگیں ہوئیں رباب" (رگوں ہوئیں رباب)، ص 37)

ماروی، اپنی دھرتی سے محبت کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو آسائشوں اور لذتوں کے بدلے میں اپنے غریب ماروئوں کی محبت اور اُن کی ہر سادہ چیز کو اُتم جانتا ہے۔ خواہشات کے بھنور میں پھنس کر لوگ اپنے نظریات اور آدرش بھول جاتے ہیں لیکن ماروی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر آسائش کو ٹھکرا کر اپنے لوگوں سے وابستگی برقرار رکھتی ہے۔ تنویر عباسی، اُسی عظیم ماروی سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

ماروی!

تم جنت سے
اپنے دیس کی طرف نظر کرو
تمہیں اپنے وطن سے الفت تھی زیادہ
قیدِ تنہائی میں بھی
تم بھلا نہ سکی اپنے ہم وطنوں کو
آج میرے دیس والوں کے
جذبۂ وطن کو کیا ہوا؟

دیس کو بیچ کر بھی اقتدار چاہتے ہیں
کرسی کی خاطر بیچ دیتے ہیں ایمان
یہ تمہاری چادر
اور تھر کے دشمن ہیں
آؤ مل کر دونوں
اس قوم کا ماتم کریں

''رنگیں ہوئیں رباب'' (رڱيون ٿيون رباب)۔ ص۔ 39)

شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی سندھی شاعری کے روشن مینار ہیں۔ سندھی زبان کے کئی شعراء نے ان کو مخاطب کر کے اشعار کہے ہیں۔ تنویر عباسی بھی اسی تسلسل میں، دیس کے دکھ درد اُن سے بانٹتے ہیں اور لطیفؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے فریاد کرتے ہیں:

شاہ بھٹائی!

سدا گونجتے رہیں تیرے نغمات
اور دیس والے تجھے یوں ہی گاتے رہیں
آج تیری ماروی قید ہے
اور سسئی، اپنے پُنہل کے لیے
آج بھی سرگرداں ہے
آج بھی عمر زیادہ طاقتور ہے
دیس کے دکھوں اور دردوں نے
جن لوگوں کے دل جلائے ہیں
وہی دل جلے
تیرے گیتوں سے بہلاتے ہیں خود کو

''رنگیں ہوئیں رباب'' (رڱيون ٿيون رباب)۔ ص: 41)

شاہ لطیفؒ سندھی زبان اور سندھ کی پہچان ہیں اور اسی تناظر میں موہن جودڑو، قدامت کے اعتبار سے، سندھی تہذیب کی، ہزاروں برس پہلے کی ایک عظیم الشان اور قابلِ فخر مثال ہے۔ موہن جودڑو کے کھنڈرات آج بھی ایک عظیم تہذیب کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ تنویر عباسی، سندھ کے عصری حالات کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ آج کا سندھ بھی موہن جودڑو کے کھنڈرات میں تبدیل ہو رہا ہے۔ تمدنی ترقی کے بجائے ہم تنزل کی طرف جا رہے

ہیں، تو ان کا من تڑپ اُٹھتا ہے اور وہ اپنے اندر کی کیفیات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

موھن جو داڑو!

اے ہمارے روشن ماضی کے
پاؤں کے نشان
تیرے ویرانے میں
اتنی کشش کہاں سے آئی ہے
تیرے ویرانے اور بربادی کو
ملنے لگی ہے وسعت
کیونکہ سارا سندھ
تیری بانہوں میں آنے لگا ہے

''رگیں ھوئیں رباب''(رگوں ہوئی رباب)۔ ص۔ 39)

جدت اور سادگی

تنویر عباسی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو سب سے پہلے جو خیال ذہن میں اُبھرے گا وہ ہے تنویر کی شعری زبان کی سادگی۔ کسی اعلیٰ اور گہرے خیال کو نہایت سادگی سے آسان زبان میں بیان کرنا، تنویر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انہوں نے کئی دیگر شعراء کی طرح کلاسیکی شعراء کی لغت پر انحصار کرنے کے بجائے، عصری دور کی مروج زبان میں اپنے افکار کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے نئے استعارے تشبیہات اور تراکیب رائج کیے ہیں۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ شاعر کو نئے دور کی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر، اپنے خیالات کو بیان کرنا چاہیے۔ اور انہوں نے اپنا یہی شعری نظریہ، برقرار رکھا ہے۔ فطرت سے قریب رہ کر انہوں نے اپنے اشعار میں پھولوں، پرندوں، تتلیوں، درختوں اور ندیوں کا زیادہ ذکر کیا ہے۔ نامور نقاد ڈاکٹر الھداد نے اس وجہ سے تنویر عباسی کو ایک تنقیدی مضمون میں سندھ کا ورڈ سورتھ قرار دیا تھا۔ اس قسم کے القاب درست ہیں یا غلط، یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن اکثر نقاد اتفاق کرتے ہیں کہ تنویر کی انفرادیت ان کی سادگی اور جدت میں ہے۔ عام شعراء نے درد کی کیفیات میں مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تنویر نے 'درد' کو بیداری کا استعارہ کہا ہے، جو کہ ایک جدت بھی ہے۔ نظم ''درد ہی اپنا مسیحا'' میں وہ کہتے ہیں:

"درد ھی اپنا مسیحا"

درد ہی اپنا مسیحا
'قم باذنی' کہہ کر جگائے
زندہ کرے مُردوں کو وہ
درد ہی پیغمبر
معجزہ جس کا ہے بیداری
نیند ہے موت کی بہن
لوریاں دے کر سُلائے
ترقی پذیر قوموں کے بچے
اونگھتے، کچھ نیند میں
کچھ گئے سکرات میں
اور کچھ موت کی خاموشی میں
درد کوئی شور ہے
جیسے اندھیرے میں
کسی مظلوم کی آواز
جو جگاتا ہے
سکرات میں پھنسے ہوئے
نیند میں سوئے ہوئے
اُٹھ کھڑے ہوں
''قم باذنی'' جب سنیں وہ

(به دھرتی۔ص۔30،ترجمه۔ا۔س)

تنویر کے ایک شعری مجموعے "سورج ہتھیلی کے نیچے" کا نام بھی ایک منفرد اور جدید نام ہے۔

سورج ہتھیلی کے نیچے چھپ گیا
چاند کو کوئی بھوکا
نان سمجھ کر کھا گیا
اور ستاروں کو

گندم کے دانے سمجھ کر
کسی نے چکی میں پیس ڈالا

تنویر نے اپنے اشعار میں نئی تشبیہات اور استعارات تخلیق کیے ہیں اور وہ استعارات، معروضی حالات کے تناظر میں جدید اور نئے ہیں۔

''سامری'' کا ہے حکم چپ رہو
تم اگر کچھ جانتے ہو
پھر بھی کچھ کہنا نہیں
درد کو سمجھو نہ ڈر
سامنے میرے ہے جھکنا
درد کو درمان جانو
میں اگر وحشی بھی ہوں
تم عظیم انسان جانو

اس نظم میں ''سامری'' کا استعارہ بہت ہی فن کارانہ انداز میں استعمال کرتے ہوئے، اپنے دور کے حالات کی طرف تنویر نے اشارہ کیا ہے، جس میں سادگی کے ساتھ جدت بھی ہے اور کہیں بھی الفاظ کا غیر ضروری استعمال نظر نہیں آتا۔ کیونکہ الفاظ کا صحیح اور درست استعمال بھی ایک فن ہے۔ تنویر کے اشعار کی زبان بھی بہت سادہ ہے اور ان کے سمجھنے میں کہیں بھی لغت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کو جدید دور کے نئے الفاظ کو شعر میں لانے کا سلیقہ بھی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

اسٹیشن کے پتھروں میں سچا موتی جیسے ہے شرمائے
نادانوں کی مجلس میں شاعر کیسے شعر سنائے

اس شعر میں تنویر نے ''اسٹیشن'' لفظ استعمال کیا ہے جو اتنا مروج نہیں ہے لیکن شعر میں بُرا محسوس نہیں ہوتا۔ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک لفظ جب استعمال کرتا ہے اُسے اہمیت ملتی ہے، ویسے تو لاکھوں الفاظ لغت میں موجود ہیں۔ تنویر ان سب حوالوں سے ایک بڑے آرٹسٹ شاعر تھے جو نہایت سادگی سے بڑی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔

بین الاقوامی شعور اور انسان دوستی

تنویر عباسی سندھی زبان کے نامور شاعر تھے اور اُنہیں اپنی دھرتی سے بھی بہت پیار تھا، لیکن ان کی

وطن دوستی کا جذبہ وسیع ہو کر بین الاقوامی سطح تک پھیل جاتا ہے۔ وہ ایک سچے صوفی اور انسان دوست تھے اور بحیثیت مجموعی ان کی تخلیقات کا موضوع انسان تھا اور وہ انسان کہیں کا بھی رہنے والا ہو اور اُس کی زبان، رنگ و نسل کیسا بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں:

تم کوئی بھی ہو
اور کہیں کے بھی رہنے والے ہو
تمہارا مذہب کوئی بھی ہو
تمہارا مسلک خواہ کچھ بھی ہو
اور تم چاہے بولتے ہو کوئی بھی زبان
رنگ و نسل، شناخت تم کوئی بھی رکھتے ہو
تم کوئی بھی کیوں نہ ہو؟
تم خود کو انسان کہلاتے ہو
ایٹمی جنگ سے تم بچو
کاش بچو
شالا جگ جگ جیو
شالا جگ جگ جیو

"ساجن سونهن سرت" (ساجن، حسن، شعور)، ص۔82، ترجمہ۔ا۔س)

تنویر عباسی ساری انسانیت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر جگہ امن اور محبت ہو اور انسانی معاشرے کسی بھی ذریا دہشت گردی کے شکار نہ ہوں۔ ہر باشعور اور انسان دوست فن کار کی طرح تنویر بھی جنگ سے شدید نفرت کرتے تھے، جس میں ہزاروں افراد بغیر کسی جرم کے مارے جاتے ہیں۔ جنگ کے خلاف ساری دنیا کی زبانوں میں شاعری کی گئی ہے اور ہر شاعر کا اپنا اپنا انداز ہے لیکن ہتھیاروں کے خلاف لکھی گئی اس نظم میں تنویر کا تخیل نہایت ہی منفرد اور اعلیٰ ہے، وہ لکھتے ہیں:

مجھے اُس دن کا انتظار ہے
جس دن موت مار ہتھیاروں کا
آخری کارخانہ بند ہو جائے
اور موت مار ہتھیار
دنیا کے کسی کونے میں
کھلونے کے طور پر بھی نہ ملیں

وہ صرف میوزیم میں رکھے ہوں

ان ہتھیاروں

اور جنگ اور دہشت گردی والی

فلموں کو دیکھ کر

ہماری آنے والی نسل کہے گی

"ہمارے آباء واجداد کتنے غیر مہذب تھے

"ساجن سُونھن سُرت"(ساجن،حسن،شعور)،ص۔92،ترجمہ۔ا۔س)

تنویر کے افکار میں اجتماعیت کا رنگ نمایا ہے۔وہ جب جنگ اور دہشت گردی کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ پورے عالم انسانیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔

جب کوئی بندوق چلے

پھر کیسے آشیانے ہوں

آشیانے ہی اُجڑ جائیں تو پھر امن کیسے ہوگا،انسانیت کیسے پروان چڑھے گی۔وہ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ خون،جو بہا ہے وہ کس کا ہے۔وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ صرف انسان کا خون ہے۔جس کا بہنا ہر انسان کے لیے باعث ندامت ہے۔

خون کے دھبے دیکھ کر رونا

ہے کس کی،یہ بات الگ

تنویر عباسی امن،پیار و محبت کے شاعر تھے،وہ جیسا سوچتے اور محسوس کرتے تھے وہی لکھا کرتے تھے یوں کہ وہ منافقت کا ان کے مزاج میں کوئی مقام نہ تھا۔

جو سوچے گا وہ لکھے گا

شاعر بات نہ کرتا دُوجی

اپنے گھر کی حفاظت کا ہر ایک کو حق ہے،لیکن آپ کا گھر تب تک ہی محفوظ رہے گا،جب تک آپ دوسرے کے گھر کی خیر چاہیں گے۔

تو میرے چمن کو آگ نہ دے

میں تیرے چمن کو آگ نہ دوں

سدا یوں ہی بس آباد رہے

یہ میرا چمن،وہ تیرا چمن

اگر سب لوگ اسی فلسفہ پر یقین رکھیں اور عمل کریں تو دنیا میں کہیں نفرت اور فساد نہ ہو۔وحدت اور اکائی

میں ہی پوری انسانیت کی نجات ہے۔ اس حوالے سے فلسفۂ ہمہ اوست کے زیرِ اثر تنویر عباسی کہتے ہیں:

تم ایک ہو
میں ایک ہوں
وہ ایک ہے
سب ایک ہیں
تم اور میں
مل جاتے ہیں
وہ اور میں
مل جاتے ہیں
ایک ہو جاتے ہیں
تم اور وہ گر
مل جاتے ہو
ایک ہو جاتے ہو
اور پھر کیا ہے
تم ایک ہو
میں ایک ہوں
وہ ایک ہے
ایک حق ہے
سب ایک ہے
سب حق ہے
حق، حق ہے

''ساجن سُونهن سُرت''، (ساجن، حسن، شعور) ص۔100، ترجمہ۔ا۔س)

دنیا کے تمام مذاہب میں انسان دوستی کے حوالے سے بیشتر باتیں یکساں ہیں اور ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی سا بھی مذہب یا مسلک اختیار کرے۔ اپنی آزادی کا حق استعمال کرنے کے ساتھ، ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کے مذہب اور مسلک کا احترام کرے۔ تنویر بھی ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں:

وہ مسجدوں کو گراتے ہیں
تم مندروں کو مسمار کرتے ہو

سارے ہی توڑنے والے ہو
کوئی جوڑتا نہیں
گر تم کچھ گرانا چاہتے ہو
تو نفرت کی دیواروں کو گراؤ
دلوں کو مت توڑو
دلوں کو جوڑو
دلوں کو جوڑو

تنویر عباسی اپنے افکار اور رویّہ میں ایک انسان دوست اور سب مذاہب کا احترام کرنے والے انسان تھے، اور ایسے خیالات ان کی شاعری میں ہمیں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ وہ سارے عوامل جن سے انسانیت کو خطرہ لاحق ہے، تنویر ان کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ جنگ، دہشت گردی یا دیگر مظالم سے نفرت کا اظہار ان کے تخلیقی اظہار میں موجود ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن قائم ہو اور سارے انسان پیار و محبت کی فضا میں اپنے اپنے دیس میں آزادی اور خوشحالی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں، کیونکہ بقول تنویر نفرت، فساد، جنگ میں کسی کی جیت نہیں ہوتی۔

یہ جس کی لاش ہے
گر ہے جیتا اُس نے
یا کھائی ہے مات
یہ میری لاش ہے
یہ تیری لاش ہے
نا جیتا ہے اُس نے
نہ ہی وہ ہارا ہے
مات ہوئے ہیں ہم دونوں
مات ہوئی ہے انسانیت

گیت نگاری

ایک تخلیق کار جب کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اُس کی آرزو ہوتی ہے کہ اُس کے فن پارے کی عوام تک رسائی ہو اور اُس کی پذیرائی ہو سکے۔ شاعری عام طور پر کتابوں کی صورت میں عوام تک پہنچتی ہے اور

کتابوں کا مطالعہ کرنے والا حلقہ بہت ہی محدود ہوتا ہے۔شاعری جب موسیقی سے ہم رکاب ہو کر کسی سُریلی آواز میں گونجتی ہے تو اُس کی رسائی کئی دلوں تک ممکن ہو سکتی ہے اور سماعت کے لیے، کسی فارمل تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی۔سُننے والا ایک عالم بھی ہو سکتا ہے تو ایک ان پڑھ مزدور بھی۔تنویر عباسی نے سندھی فلم سوال رانو کے لیے بھی گیت تحریر کیے تھے۔نور جہان اور مہدی حسن کی آواز میں اس فلم کے لیے ریکارڈ کیے گئے تنویر عباسی کے گیت آج بھی مقبول ہیں۔جن کے بول تھے:

میں تم پر واری رانا۔	گائیک۔نور جہاں
آپ سے پریت لگا کر ہم نے۔	گائیک۔مہدی حسن

اس طرح تنویر عباسی کے کچھ خاص گیت جو نامور فن کاروں کی آواز میں مقبول ہوئے،ان کے بول کچھ یوں ہیں:

آؤ پاس ہمارے بیٹھو۔	گائیک۔عابدہ پروین
میں نے پہچانی آنکھیں۔	گائیک۔محمد یوسف
کچھ دیکر جائیں گے۔	گائیک۔عابدہ پروین
ہر پل ہے اک گھاؤ۔	گائیک۔ابراہیم
تیری محفل میں۔	گائیک۔برکت علی
تتلی،کلی سے پیار کرے	گائیک۔حمیرا چنہ
تم جو میری طرف	گائیک۔دیدار حسن سموں
خشکی پر ہریالی آئے	گائیک۔وحید علی
من گھبرائے کیوں	گائیک۔رُوبینہ قریشی
روٹھنے کے دن	گائیک۔سینگھار علی سلیم
آنکھ ملائیں گے بہت	گائیک۔ممتاز لاشاری
تمہاری نظریں	گائیک۔روبینہ قریشی
اس طرح بہاروں سے	گائیک۔محمد یوسف
یہ کس کی آواز	گائیک۔صادق علی اور روبینہ قریشی
آؤ گیت پریت کے گائیں	گائیک۔محمد یوسف
اندر جلائے روشن زمانہ	گائیک۔سینگھار علی سلیم
آپ کے بغیر اپنا دل	گائیک۔محمد یوسف
درد بہت ہیں جس کے پاس	گائیک۔عابدہ پروین

میرے سوہنے سائیں	گائیک۔روبینہ قریشی
چھم چھم چھنکے پائل	گائیک۔ثمینہ کنول
جیسے ہی تمہیں دیکھا	گائیک۔رحمت علی میرالی
کل تم سے جو روٹھ کر	گائیک۔حمید راجپر
ایسے گھبراتا سدا	گائیک۔عابدہ پروین
لوگ پھولوں سے	گائیک۔ممتاز لاشاری
بادامی آنکھوں والے لوگ	گائیک۔برکت علی

تنویر عباسی کی ان غزلوں اور گیتوں کے علاوہ اور بھی کئی گیت اور غزلیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔بچوں کے لیے بھی ان کے کئی گیت ریڈیو پاکستان حیدرآباد پر ریکارڈ ہوئے، لیکن افسوس کہ وہ محفوظ نہ ہو سکے۔تنویر عباسی کے ان گیتوں اور غزلوں کے بول نہایت سادہ اور روح میں اترنے والے ہیں۔وہ واقعی ایک بہت سُریلے شاعر (Lyrical Poet) تھے۔تنویر عباسی کارنر، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی خیرپور کی جانب سے کارنر کے انچارج نامور شاعر ایاز گل نے، تنویر عباسی کے گیتوں اور غزلوں پر مشتمل دو آڈیو کیسٹیس بعنوان ''میں نے پہچانی آنکھیں'' اور ''پوان شل قبول ''، '' کاش ہو جاؤں قبول'' 2006ء میں جاری کیں۔اس طرح تنویر عباسی کے کئی گیت اور غزلیں یک جا ہو کر ان کے پرستاروں تک پہنچیں اور محفوظ بھی ہوئیں۔

شعری اصناف

تنویر عباسی کسی ایک صنف کے حوالے سے مشہور نہ تھے، بلکہ مجموعی طور پر انہوں نے غزل، بیت، وائی نظم، آزاد نظم، نثری نظم، گیت، دوہے اور ہائیکو میں اپنے احساسات وافکار کو احسن انداز میں قلم بند کیا ہے۔کوئی بھی جینئس تخلیق کار کسی خاص صنف کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ وہ حسب ضرورت اپنے اظہار کے لیے کوئی بھی صنف اختیار کر سکتا ہے۔تنویر عباسی بھی ایک ایسا ہی شاعر تھا، جس نے کبھی کسی صنف کی پرواہ نہیں کی۔انہوں نے 'وائی' اور 'بیت' جیسی سندھی کلاسیکی اصناف میں بھی جدید رنگ بھرا اور زبان بھی اپنے دور کی استعمال کی ہے۔کچھ شعراء ان کلاسیکی اصناف میں کلاسیکی شعراء کی لغت استعمال کرنے کے حامی ہیں، لیکن تنویر، ان رویوں کو رد کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

"سندھی شاعری میں پہلا کام یہ ہوا کہ جو بھی کلاسیکی اصناف ہیں، ان کو جدید موضوعات سے ہم آہنگ کیا گیا، اس طرح ان کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔"

(ادبیات۔خالد اقبال یاسر سے گفتگو)بحوالہ:مہران تنویر نمبر. ص85

دوہے، بیت اور وائی سندھی زبان کی کلاسیکی اصناف سخن ہیں۔تنویر عباسی نے ان اصناف میں جدید طرز اظہار اختیار کرتے ہوئے بھی ان کی روایتی ہیئت برقرار رکھی ہے۔ان تینوں اصناف میں سے کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

دوہا(ڈوھیڑا)

میں شاعر ہوں پاس ہے میرے ہر بندے کا مان
میرا مان مگر جانیں ہیں کچھ تھوڑے انسان

میرے گیت کبوتر جیسے تنہا اور اُداس
سندر اور معصوم تھے لیکن پھر بھی رہے نراس

تو جو میرے سامنے آئے مجھے ہوا گمان
میرے گیتوں نے سانسیں لی ہیں بن گئے وہ انسان

بیت

پھول تو آخر پھول ہے، کسی بھی رنگ کا ہے
اُس کی شان بڑھے، جس مٹی میں وہ اُگے

راہو تیری ریت، سب نے سیکھی ہے کہاں
دھرتی سے پریت، سب کا کام نہیں ہے

نہ کوئی ساز نہ سوز، بس ہے راگ وجود کا
تم رونق افروز، جس طرف جائے نظر

وائی

جیسے ہی دیکھا تمہیں
زندگی پر
ہو گیا ایمان تازہ
تم سے کچھ باتیں ہوئیں
دوستی پر
ہو گیا ایمان تازہ
پیار جو تُجھ سے کیا
آدمی پر
ہو گیا ایمان تازہ
حُسن کو سجدہ کیا
بندگی پر
ہو گیا ایمان تازہ
اشعار کچھ تم پر لکھے
شاعری پر
ہو گیا ایمان تازہ

دوہے، بیت اور وائی کے علاوہ تنویر عباسی نے جدید اصناف سخن غزل، گیت، نظم، آزاد نظم، نثری نظم اور ہائیکو وغیرہ میں بھی اپنے تخلیقی جوہر کو بہتر انداز میں نمایاں کیا، اور ان اصناف پر ان کی گرفت بطور ایک

باکمال شاعر، مضبوط نظر آتی ہے۔ ان اصناف کی مثالیں حاضر ہیں۔

غزل

میں ہوں خود ہی اپنا جانی
سبحانی ما اعظم شانی

دو چیزوں بن سب کچھ فانی
تیرا حسن و میری جوانی

"نا" میں ڈھونڈے اپنی ہستی
دل دیوانی دل دیوانی

آنکھوں میں اُگتے ہیں کانٹے
دل کے رستوں پہ ویرانی

پیار کے آگے بے معنی دو
کیا دانائی کیا نادانی

گیت

پیار سے گر تم مجھ سے کہو گے
پیار سے میں بھی کہوں گا
تم چاہو تو میں بھی چاہوں
راہ میں چلتے چلتے تم سے
کسی حسیں درخت کے نیچے
اپنی ملی جو نگاہیں ہیں
دل سے دل تک راہیں ہیں
تم گر دو گے یہ دل مجھ کو
میں بھی تمہیں دل دوں گا
تم چاہو تو میں بھی چاہوں گا
تیری نگاہ نے کیا سمجھایا

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا
دل میں اک ارمان ہے جاگا
میرا دل کچھ زور سے دھڑکا
تم سمجھاؤ پیار سے مجھ کو
تو میں بھی کچھ سمجھوں گا
تم چاہو تو میں بھی چاہوں

نظم

سورج تنہا ہوتا ہے
چاندا کیلا ہوتا ہے
میں تو کوئی سورج نہیں
اور نہ کوئی چاند ہوں میں
میں اک چھوٹا تارا ہوں
اک معصوم ستارہ ہوں
بندہ ہوں اک عام سا
بات بڑی نہیں کرتا
میں نا آپ سے کمتر ہوں
میں نا آپ سے برتر ہوں
میں تو آپ جتنا ہوں
میں تو آپ جیسا ہوں

نثری نظم

آؤ امن کے چاہنے والو
آؤ ایک جنگ کریں
جس میں سارے مہلک ہتھیار
اور اُن کے پیچھے سارے
تعصب اور نفرتیں

ختم ہو جائیں
آؤ ایک قبرستان بنائیں
جس میں انہیں دفن کریں
تاکہ اس کے بعد کوئی جنگ نہ ہو
اور نہ کوئی قبرستان بنے
یہ آخری جنگ
یہ آخری قبرستان

آزاد نظم

صرف بازگشت، سُن پا رہے ہو
آوازوں کو سُنتے، مگر تم نہیں
صرف عکس رہتے ہیں آنکھوں میں تیری
نہیں دیکھتے تم مگر روشنی کو
حقیقت کی جانب تو آتے نہیں ہو
سایوں کے پیچھے مگر بھاگتے ہو تم
یہ خوابوں کی دنیا، خیالوں کی دنیا
مگر ان سے آگے تو جاتے نہیں ہو

ھائیکو

کوئل کی کو کو
اتنی تیز دھوپ میں
تربوز کی خوشبو

چہرے پہ غصہ
کوٹ کے کالر پر
پھول رہا ہنستا

بارش میں بھیگی کار

سرد رات جاڑوں کی
کس کا انتظار

پت جھڑ کی رُت آئی
پتے گرے درختوں سے
ہنستا رہا کھجور
کم نہ ہوگا پیار
جوں جوں بال سفید ہوں
بڑھتا جائے یار

یہ دبئی کی شام
میرے سامنے آئینہ
جیسے نارائن شیام

ان جدید یا کلاسیکی اصناف میں، اپنے منفرد اظہار کے حوالے سے تنویر عباسی ہمیں ایک مکمل شاعر نظر آتے ہیں۔

شاعری سے انتخاب

مستقبل جو کاتب آهيان
منهنجي هٿ ۾ لوح وقلم آ
هاڻي آءٌ نه سوليءَ چڙهندس
هاڻي تنهنجو وارو آهي
پنهنجو پيار به پارس آهي
لوهه لوهه کي سون بنائي

ترجمہ:

مستقبل کا کاتب ہوں میں
میرے ہاتھ میں لوح و قلم ہے
میں نہ چڑھوں گا سولی پر
اب تو تیری باری ہے
اپنا پیار بھی پارس ہے
ہر لوہے کو سونا بنائے

☆

هي ماڻهن جو جهنگل ,ڪنڊا ڪرڙ ماڻهو
رهڙجي ويس مان ۽ ڦٽجي ويس مان

ترجمہ:

یہ لوگوں کا جنگل سارے لوگ کانٹے
بہت آئیں چوٹیں اور گھائل ہوا میں

☆

مون توکي هٿ ڏنا
ان لاءِ ته ڪم ڪرين
۽ تون اُنهن هٿن کي
گهڙي گهڙي ۽ هرويلي
دعا جي لاءِ کڻين

ترجمه:

میں نے تمہیں ہاتھ دیے
کہ تم کام کرو
مگر تم ہو کہ
بار بار ان ہاتھوں کو
اُٹھاتے ہو دعا کے لیے

☆

هي جو سورج اُڀريو آهي
منهنجو رت ڦڙو آهي
شعر لکجن تنوير
جڏهن الهام اچي

ترجمه:

یہ جو سورج نکلا ہے
میرے لہو کا قطرہ ہے
شعر لکھیں گے تنویر
جب کوئی الہام ہو

☆

نوان سج چڙهيا
نوان ڪوڙ ظاهر ڪيا
نوان ڏينهن آيا
نوان نينهن آخر ڪيا

ترجمه:

نئے سچ کہیں گے

اور نئے جھوٹ کریں گے بے نقاب
نئے دن آئے ہیں
اب نئی چاہتیں ہوں گی

☆

ماضيءَ تي تا پاڻ پڏابو
حال ۾ کھڙا آهيو

منهنجي جھوليءَ ۾ گُل آهن
تنهنجي جھوليءَ ۾ گُل آهن

اسان جي محبت ڪندي معجزو
نہ رهنديون اِهي نفرتون نفرتون

بنا سنهن جي ماڻهو سڃاڻڻ بہ مشڪل
الا ڏبس کهڙي مان اڙجي وبس مان

ڪڏهن دشمن ۾ بہ ڏپ ناهي ڏيندو
ڪڏهن دوستن ۾ بہ گهبرائبوآ

چاہہ ٿئي جڳ ۾ تنوير
جهڙو هو اهڙو آهي

سئو مجبوريءَ جاافسانا
تنهنجي سانت ٻڌايا آهن

ڪوسندن احترام رقاضيءَ شهر
درد منڊن جو پنهنجو درجوآ

ترجمہ:

تمہیں فخر ہے ماضی پہ
حال میں کیسے ہو

پھول ہیں میری جھولی میں
تیرے ہاتھ میں پتھر ہیں

محبت دکھائے گی یہ معجزہ

نہ ہوں گی کہیں پر بھی یہ نفرتیں
بن چہرے لوگوں کی پہچان مشکل
میں پھنس گیا ہوں کس دیس میں
کبھی خوف ہوتا نہیں دشمنوں میں
کبھی دوستوں میں بھی لگتا ہے ڈر

کچھ بھی ہو جگ میں تنویر
جیسا تھا ویسا ہی ہے

تیری خاموشی نے سُنائے
مجبوری کے سو افسانے

اے قاضیِ شہر تم کرو احترام
درد مندوں کا ہے ایک اپنا مقام

☆

ارپنا

چيٽ جي ڀرين ڦونهڙي جي نالي
ساوڻ جي ڀرين وسڪاري جي نان ۽
سند بسنت ۾ ترندڙ ڀرينُ سڪڙيُ نالي
نئين جاول جي ڀرين ڀرين ساهَ جي نان ۽
گليشيئر مان ,ساوڻ جي اُس سان ڳرندڙ
ڀرين ڦُڙي جي نان ۽
نئينُ ڪنوار جي ڳلَ تي وڀرين هٿَ ڇُهاءَ سان
ايندڙ سُرخيُ نان ۽
ڀرين قومپرست جي هاريل
ڀرين رت ڦُڙي جي نان ۽
پيڙيل قوم جي ڀرنين ڀرنين
بي اختيار ۽ باغي نعري جي نالي

تنهنجي نالءِ
جنهن جوڪوئي نالو ناهي
سڀئي نالا جنهن جا آهن

(تنوير چنڌي-ارپنا)

Dedication (Arpana)

To the first flower of spring
To the frist shower of the rainy season
To the frist bloom which heralds spring's coming
To the very first breath of the new-born
To the frist drop of water, trickling down a glacier
Under the summer sun
To the frist blush on the face of a bride
Trembling at the first touch
To the frist drop of blood
Shed by the first nationalist
To the frist rebellious shout
Which araises from a long-suppressed nation
To you
Who have no name,
But have all the names.

(Translated by: Asif Faraukhi

سون ڏنو ,آهيان ڏيئو
جي ٻران ٿوسان ته آهي روشني
وقت سنهنجي لاٽ جي جرِ ۾ جلي
دونهون ٻڄي وبو فضا ۾ جذب ٿي
سنهنجي چئني طرف سنهنجي روشني

جنهن سان هيءَ دنيا چٽي چلڪي پئي
جي وسامان ٿوته اوندهه ,خاموشي
ڪا حقيقت ناهي ڪنهن ٻي چيز جي
سان سدابرندو ٿي رهندس
روشنيءَ جي لاءِ
پنهنجي زندگيءَ جي لاءِ
(شعر-ص:٦٦)

Light

I feel that I am a flaming torch
Whenever I burn, there is light all around
Time is on fire in my flames
Turns to smoke and is lost in the air
Spread in the four corners of the earth
And all around me is my light
Which makes the world glow.
If were to burn out
It would be dark
Silence all around
With no reality
Nothing.
I will keep on burning
For the light
For the Sake of my life.

(Translated by: Asif Faraukhi)

جڻ مان ڪو پوپٽ پڪڙيان ٿو
ياڪوگل گلاب چنان ٿو
يا ڪنهن سُهڻي من مُهڻي جو
نازڪ نازڪ ڳل ڇُهان ٿو
ياڪنهن وڄ کي
پنهنجي مُٺ ۾ بند ڪريان ٿو
شعر لکان ٿو

(سڄ تريءَ هيٺان -ص:٨٦)

I am writing a Poem

I am writing a poem
As if I was catching butterflies
Or plucking a rose
Or caressing the face of a beautiful girl
As if I am holding the lightning
As if I am holding a whirlwind in my clenched hands

Translated by: Asif Faraukh

مان ڪورو ڪاغذ ناهيان

مان ڪورو ڪاغذ ناهيان
جنهن تي چاهيندين جو لکندين
ٻارڙي ڦرهي ناهيان، جنهن کي
ميساريندي لکندو رهندين
اڻ ڏهندڙ تحرير مان آهيان
۽ پنهنجي تقدير مان آهيان
مان آهيان هڪ ازلي ليڪُ
منهنجي اک ۾ سچ جو ٽيڪُ
(نوڙهي واري واقعي تي)

(هيءُ ڌرتي -ص:١١)

A sheet of paper

I am not a sheet of blank paper
I am not a sheet of blank paper
On which you can write
Whatever you may please.
I am not a child's slate
On which you can write
And then rub and write,
Whenever you want to write
Choosing whatever you want to write
I am a script which cannot be earsed.
I am my own future
I am my own fate
I am the eternal writing
I have the sun in my eyes.

(Translated by: Asif Faraukhi)

ناقدین و معاصرین کی آرا

ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تنویر عباسی ایک محقق بھی ہے، لیکن شاعری میں وہ منفرد لہجے، اسلوب اور
ٹھی زبان کی بدولت ایک اہم شاعر ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مخصوص زبان و بیان
الے شاعر ہیں۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے پہلے ان کا کلام روایتی انداز کا تھا، جس سے
نویر نے چھٹکارہ حاصل کیا اور زیرِ اضافت سے اپنے اشعار کو بچایا۔

امداد حسینی

ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے تنویر کو زبان کی خوبیوں کا ادراک گہرا اور پُرانا ہے اور وہ اس کو بطور
تھیار استعمال کرتا ہے۔ چمکتے ہوئے کھوکھلے الفاظ کو جمع کرنے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تنویر کے
ال زبان کی اہمیت صرف ایک آلۂ اظہار کی ہے، جس کے مفید اور بامقصد استعمال پر اسے مکمل عبور
حاصل ہے۔ وہ کسی مصلحت کی خاطر قلم کو میز کے خانے میں بند کر کے، تالا لگا کر کنجی سمندر میں نہیں
پھینکتا، بلکہ قلم کو علَم بنا کر سماج کے استحصال زدہ اور خوف زدہ لوگوں کے سروں کے اوپر لہراتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی خادم

تنویر عباسی کے کئی رنگ ہیں، وہ انقلابی بھی ہے، رومانوی بھی، حقیقت پسند بھی اور جذباتی بھی۔ اُس
کے اشعار سے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو کو اچھی طرح محسوس کیا ہے۔ اپنے
شعراء کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح تنویر کی مماثلت، کسی انگریزی رومانوی شاعر پال ویلری، ایزرا
پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ سے کی جا سکتی ہے، لیکن یہ غلط ہوگا، کیوں کہ تنویر کا اپنا ایک جداگانہ اسٹائل اور
مقام ہے۔ اس کی شاعری دیس کے سادہ عوام کے جذبات اور امنگوں کا اظہار ہے۔ تنویر سندھ کا سپوت

ہے اور سندھ باسیوں کے من میں اُس کا بہت بلند مقام ہے۔ جدید سندھی شعراء میں تنویر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شاعری میں جہاں جذبات کی شدت ہے، وہاں شعور کی تیز رفتار دھارا بھی ہے۔

ڈاکٹر ملک ندیم

تنویر کے پاس حقیقت پسندی پر مبنی فلسفے سے بھرا تصور اور تخیل ہے، جو شاعری کا حسن اور سنگھار ہوتا ہے۔ تنویر نے ابتدا سے آخر تک، زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنے خیالات، اپنے شعری اظہار میں تبدیل نہیں کیے۔ انہوں نے سماجی مسائل اور حسن و عشق کی باتیں فلسفیانہ انداز میں سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کی ہیں اور یہی انداز شاعری کو عظمت دیتا ہے۔

مختیار ملک

تنویر کے معنی ہی روشنی ہے اور تنویر عباسی ایک روشن خیال وجود ہے۔ تنویر کے افکار میں روشنی، روشن مستقبل کی علامت ہے۔ روشنی کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے اور تنویر اُس سفر کا راہی اور مسافر ہے، جس کے فکری کینوس پر روشن الفاظ کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں ان الفاظ کے ذریعے، جذبات و احساسات کی دنیا، خوردبین کے بغیر دکھاتے ہیں۔ تنویر نے روشنی کی امانت کو آنے والے دور میں منتقل کیا اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ اُسی روشنی سے اپنے دل و دماغ روشن کریں اور تنویر سے ملی ہوئی اُس روشن دھارا کو نئی نسل تک باسلامت پہنچائیں۔

نجمہ نور

تنویر عباسی سندھی زبان کے دانشور شاعر تھے۔ ان کا کلام سادگی اور نفاست کے ساتھ نہایت فکر انگیز ہے۔ وہ بڑے سے بڑا خیال نہایت آسان زبان میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ میں ان کی شاعری سے متاثر تھی۔ بحیثیت انسان بھی وہ اعلیٰ خصوصیات کے مالک تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے میرے مجموعۂ کلام "چاند اور اجرک" کا پیش لفظ لکھا تھا۔

ڈاکٹر غفور میمن

تنویر بنیادی طرح کا انسان دوست شاعر ہے، جو کہ سندھ کے ہر روشن خیال اور ترقی پسند شاعر کی خصوصیت رہی ہے۔ وہ انسانوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافی کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ ان چند مفاد

بستوں کی مخالفت کرتا ہے جو طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر، مذاہب اور نظریات کی آڑ ۔۔۔
رتے ہیں۔تنویر ایسے عمل کو بیچ اور غیر انسانی سمجھتا ہے۔تنویر کی نظر میں جنگ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی،
یوانی فعل ہے۔جس میں انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔اُس کی شاعری کے سُر ٹھنڈے اور جمالیاتی
یں،وہ جو کچھ بھی کہتا ہے،اُس میں فکری گہرائی اور فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ مسلسل روانی ہے،کہیں بھی
کاوٹ نہیں ہے،بس ایک دھارا ہے، مسلسل جستجو کی بات ہے۔وہ ادب کی کئی رجحانات کی نمائندگی
رنے والا لکھاری ہے،اس کی شاعری میں وجودی فکر کی دھارائیں بھی پھوٹتی ہیں تو اُس نے رومانوی
اعری بھی کی ہے۔وہ حسن و جمال، سچ اور پیار کے چوگرد پھرنے والا شاعر ہے۔ ہمیشہ حق و صداقت کی
لاش میں رہتا ہے۔اسی سفر میں اس کا محور انسان پسندی ہے،جس کے لیے وہ روشن خیالی،فکر اور ترقی
سندی کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

نثر نویس

بحیثیت لطیفؒ شناس

تنویر عباسی کی بنیادی پہچان ایک شاعر کی ہے لیکن تحقیق کے شعبہ میں ان کا کام بھی نہایت اہم اور انفرادیت رکھتا ہے، خاص طور پر لطیفؒ شناسی کے حوالہ سے گربخشانی، جی ایم سید، رسول بخش پلیجو کے بعد تنویر عباسی نے شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی کے کلام پر جدید انداز سے تحقیق وتنقید کی ہے۔ شاہ لطیفؒ اپنی دھرتی اور زبان کی نسبت سے عوام میں عقیدت کی بنیاد پر بڑا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ اپنی فکری وفنی بلندی کی بدولت انفرادی شناخت رکھتے ہیں اور وہ واقعی ایک بہت بڑے آرٹسٹ ہیں جن کا فن ڈھائی سو برس گزرنے کے باوجود آج بھی اپنی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔

جیٹھمل پرسرام اپنے دور کے ایک نامور عالم اور دانشور تھے اور کسانوں کی جدوجہد میں ہاری تحریک کے پلیٹ فارم پر ایک انقلابی رہنما کی حیثیت سے بھی ان کا ایک نمایاں کردار رہا ہے۔ ایک مرتبہ جیٹھمل پرسرام نے انگریز سرکار کے خلاف ایک مضمون شائع کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے شاہ لطیفؒ کے انقلابی ابیات بھی شائع کیے تھے۔ انگریز سرکار نے اس مضمون کا نوٹس لیا اور ایچ ٹی سورلے نے بحیثیت مجسٹریٹ، جیٹھمل پرسرام کے ساتھ شاہ لطیفؒ کے بھی گرفتاری وارنٹ جاری کر دیے۔ جب کارندوں نے ایچ ٹی سورلے کو بتایا کہ یہ شاعر تو دو صدیاں پہلے گزر چکے ہیں، تو وہ حیرت زدہ ہوئے۔ شاعری کی اثر انگیزی اور افادیت نے اُسے بہت متاثر کیا اور اُس نے شاہ لطیفؒ کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ شروع کر دیا اور وہ شاہ کے مداح بن گئے۔ آگے چل کر شاہ لطیفؒ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے اسکالر کا اعزاز بھی ایچ ٹی سورلے کو ہی حاصل ہوا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ شاہ لطیفؒ کسی ایک دور کا نہیں بلکہ ہر دور کا شاعر ہے۔

تنویر عباسی نے شاہ لطیفؒ کے کلام کا مطالعہ پہلے بھی کیا تھا لیکن 1965 میں جب ملک کے آسمان پر جنگ کی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی تو ذہنی کرب دور کرنے کے لیے انہوں نے رات رات بھر جاگ کر شاہ لطیفؒ کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے شاہ کو پڑھا

تھا، اب وہ ایک شاعر کے روپ میں، نئے فکری زاویوں سے شاہ لطیفؒ کو پڑھ رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مقالات لکھتے گئے۔ انہوں نے ٹی ایس ایلیٹ کے اس جملے کو مشعلِ راہ بنایا کہ:

''زندہ قومیں اپنے شعراء کو تبدیل شدہ حالات کے تحت بار بار پڑھتی اور پرکھتی رہتی ہیں۔''

شاہ لطیفؒ کی شاعری کے حوالے سے ناقدین کی رائے ہے کہ جی ایم سید، محمد بخشانی، رسول بخش پلیجو اور تنویر عباسی نے شاہ کے کلام کو، جدید فکری انداز میں نئے تنقیدی زاویوں اور اصولوں پر پرکھا اور ترقی پسند نقطۂ نظر سے اس کی تشریح کی ہے۔ تنویر عباسی کی کتاب ''شاہ لطیفؒ کی شاعری'' جو پہلے تین جلدوں میں علیحدہ شائع ہوئی، اُسے یک جا کر کے ایک جلد میں شائع کیا گیا۔ پہلی جلد کے پبلشر اور نامور تعلیمی ماہر پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ، تنویر عباسی کی لطیفؒ شناسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تنویر عباسی ہمارے اول درجہ کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے شاہ لطیفؒ کو ایک نئے انداز اور نظریاتی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ بھوک، محنت، جفاکشی، پروردگار پر توکل، خود پر بھروسہ کے ساتھ معاشرے سے محبت اور اس کی ترقی و خوش حالی کے لیے جستجو، اس کتاب کے مضامین کا مقصد ہے۔ ہم خوش ہیں کہ تنویر صاحب نے روایتی انداز کو چھوڑ کر ایک نئے تحقیقی کام کا آغاز کیا ہے۔''

(شاہ لطیفؒ کی شاعری۔1995، ص9)

شاہ لطیفؒ کو سندھی ادب میں وہی حیثیت حاصل ہے جو شیکسپیئر کو انگریزی میں، یا بابا بلھے شاہ کو پنجابی میں حاصل ہے۔ اس کی زندگی و فن پر سندھی ادب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں شاہ لطیفؒ جو ایک ولی، پیر اور درویش ہے، وہ شاعر، شاہ لطیفؒ پر حاوی ہے۔ اس لیے یہ لازمی تھا کہ لطیفؒ کی تخلیقی پہچان کو اُجاگر کیا جائے اور بطور ایک عظیم شاعر ان کی شاعری کو دلائل کی روشنی میں زیرِ بحث لایا جائے۔ تنویر عباسی، اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں مغربی نقادوں کی آراء کی روشنی میں شاہ کے فن کو پرکھا گیا ہے۔ اگر ہم نے تنقید کے ان نئے طریقوں سے آنکھیں پھیر لیں تو ہم شاہ لطیفؒ کی کئی خوبیوں سے محروم ہو جائیں گے۔''

(شاہ لطیفؒ کی شاعری۔1995، ص16)

کتاب شاہ لطیفؒ کی شاعری میں 12 مقالات 9 تقاریر شامل ہیں۔ پہلے مقالے کا عنوان ہے ''شاہ لطیفؒ کی شاعری کا ادبی پس منظر''۔ اس فکر انگیز مقالے میں تنویر نے سندھی کلاسیکی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مقامی پس منظر میں شاہ کی شاعری پر برصغیر کی شاعری پر مذہبی اور عربی اثرات اور فارسی شاعری کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں انہوں نے اپنے اس مقالے میں 29 حوالے دیے ہیں۔

قاضی قادن، شاہ لطف اللہ قادری، شاہ عنایت، شاہ کریم، خواجہ محمد زماں سے لے کر بھگت کبیر، گرو نانک، دادو دیال، سمن، تلسی داس، بابا فرید گنج شکر، رومی، میراں بائی اور دیگر شعراء کی شاعری نے شاہ کی شاعری کی مماثلت کرتے ہوئے تنویر نے لکھا ہے کہ شاہ اپنے دور کے بہت بڑے ذہین انسان تھے جنھوں نے نہ صرف اپنے کلاسیکی شعراء کا مطالعہ کیا بلکہ دیگر ہم عصر زبانوں عربی، ہندی اور فارسی کے شعراء کے فکر سے بھی آشنا تھے اور برصغیر کی فکری وادبی تحریکوں کا علم رکھتے تھے۔

''شاہ لطیفؒ کی شاعری کا سیاسی وتاریخی پس منظر'' کے موضوع پر تنویر عباسی نے، شاہ لطیفؒ یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے ایک پروگرام میں لیکچر دیا تھا، جسے بعد میں ترتیب دے کر ایک مقالے کی شکل دی گئی۔ اس مقالے میں مختصر مگر جامع انداز میں کلہوڑا دورِ حکومت کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے، انٹلیکچوئل تحریکوں، وحدت الوجود، وحدت الشہود، منصور حلاج کا نعرۂ انا الحق، گوتم، اورنگزیب، آدم شاہ، دارا شکوہ، شاہ عنایت کی شہادت اور دیگر شخصیات اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہ لطیفؒ وحدت الوجود نظریہ کا قائل تھا، جس کی بنیاد رواداری ہے، جس میں کسی بھی تعصب کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ لطیفؒ کی شاعری میں جس مذہبی اخلاقی اقدار، تقدیر پسندی، سماجی اخلاقی اقدار، ذات پات، اقدار کی تبدیلی کے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس مقالے میں محمد ابراہیم جویو کی کتاب ''شاہ، سچل سامی''، ایچ ٹی سارلے کی ''شاہ لطیفؒ آف بھٹ'' اور قاضی جاوید کی دو کتابوں ''برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء'' اور ''ہند مسلم ثقافت'' سے حوالے دیے گئے ہیں۔ تنویر نے اس مقالے میں عورت کی جاگیردارانہ سماج میں حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سماج کے مہذب ہونے کا معیار یہ ہے کہ اُس میں عورت کو کیا درجہ دیا گیا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی سورمی، سوہنی، مروج جاگیردارانہ اقدار کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے تنویر نے شاہ لطیفؒ کے ایسے ابیات کا ذکر کیا ہے جو مذہب کا وسیع تصور پیش کرتے ہیں، جن میں محبت اور انسانیت، امن و آشتی کا پیغام دیا گیا ہے اور ان کے حاصلات کے لیے منفی اور بناوٹی سماجی رویوں کو رد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ شاہ لطیفؒ بیداری کو اولیت دیتے ہیں اور اُن کو اپنا دوست سمجھتے ہیں جو اپنی نیند قربان کر کے مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ تنویر عباسی نے اس مقالے میں زرعی اور جاگیردارانہ سماج کے اقدار کو شاہ لطیفؒ کے افکار کی روشنی میں، دانشورانہ انداز میں واضح کیا ہے اور غیرت کو جاگیردارانہ سماج کی قدر (Value) قرار دیا ہے۔

مقالہ بعنوان شاہ لطیفؒ کی عوامی شاعری میں تنویر عباسی نے میر علی شیر قانع، مولانا دین محمد وفائی اور ٹی ایس ایلیٹ کے زبان کے بارے میں خیالات بیان کرتے ہوئے، سندھی زبان کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ جب سارے ہندوستان میں فارسی زبان کا بول بالا تھا اور فارسی شعراء درباروں تک رسائی

حاصل کرنے میں مصروف تھے، اُس وقت شاہ لطیفؒ نے ان روایات کی نفی کرتے ہوئے اپنی عوامی زبان کے فروغ میں کردار ادا کیا اور فارسی اسالیب کی جگہ عوامی اصناف سخن، وائی اور بیت میں تخلیقی اظہار کیا۔ شاہ لطیفؒ کی زبان اور لہجہ، دونوں عوامی ہیں۔ تلسیداس کی رامائن میں عام لوگوں کا ذکر کم اور دیویوں، دیوتاؤں اور سپہ سالاروں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ فردوسی کے شاہنامے میں یا شیکسپیئر کے ڈراموں میں بادشاہوں اور امیروں کا ذکر ملتا ہے لیکن شاہ لطیفؒ نے جولاہوں، ملاحوں، لوہاروں اور کسانوں کو اہمیت دے کر اُن کے کردار و عمل کو سراہا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ اُس کی شاعری ایک عام آدمی سے لے کر پڑھے لکھے عالم تک یکساں مقبول ہے۔ تنویر عباسی لکھتے ہیں:

''امریکی شاعر والٹ وٹمین کے لیے پورا امریکہ ایک شعر کی طرح تھا۔ اسی طرح شاہ لطیفؒ نے وٹمین سے بہت پہلے سندھ کو ایک لافانی اور لازوال شعر بنا دیا تھا۔''

تنویر عباسی نے ایک مقالا ''شاہ لطیفؒ کی شاعری میں موسیقی'' کے بارے میں لکھا ہے۔ سندھ کے لوک گیتوں اور لوک ناچوں کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے انہوں نے شاعری اور موسیقی کے باہمی تعلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ شاہ لطیفؒ خود بھی موسیقار تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ تنویر نے شاہ لطیفؒ کے اشعار میں اندرونی قافیوں اور تجنیس حرفی کے ذریعہ پیدا شدہ موسیقی پر بھی کافی بحث کی ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے جی آر کی کتاب ''بیک گراؤنڈ آف ماڈرن پوئٹری'' ازرا پاؤنڈ کی ''لٹریری ایسیز'' آئی اے رچرڈز کی کتاب ''پرنسپلز آف لٹریری کرٹسزم'' اور دیگر کتب سے حوالے دیے ہیں۔

''شاہ لطیفؒ کی عکسی شاعری'' ایک ایسا موضوع ہے جس پر تنویر عباسی سے پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ پروفیسر کلیان آڈوانی نے ''الفاظ میں تصویر'' کے عنوان پر لکھا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی شاعری فطرت کے حیرت ناک تنوع کے مشاہدات کی نہایت دلچسپ اور پُر اثر تصویر ہے جس میں فطرت کے حسین مناظر یعنی سندھ کے ریگستان، سمندر، پہاڑ، تیرتی ہوئی کشتیاں، پرندے، پھول، جنگل، ڈھلتا سورج، ندیاں، اونٹوں کی قطاریں اور ایسے سینکڑوں مناظر اور نظارے شاہ کی شاعری کی گرفت میں آ گئے ہیں۔ تنویر عباسی لکھتے ہیں:

''اگر شاہ لطیفؒ کا مطالعہ صرف ایک عکسی شاعر کی حیثیت سے کیا جائے تو اُن کے عکس، دنیا کے کئی شعراء کے عکسوں سے بہتر ہیں۔ وہ کسی بھی ماحول کو دوبارہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

شاہ لطیفؒ فطرت کا مصور شاعر ہے، ان کے کلام میں خوبصورت عکسوں کے ساتھ رنگوں کا بھی

خوبصورت استعمال ہے۔ شاہ کا کوئی ایسا سُر نہیں، جس میں رنگوں کا ذکر نہ ہو۔ تنویر عباسی نے ''شاہ لطیفؒ کی شاعری میں رنگوں کا مطالعہ'' کے عنوان سے ایک نہایت عالمانہ مقالا تحریر کیا ہے۔ اس میں بھی انہوں نے اپنا منفرد انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ شاہ کے مختلف ابیات میں سے رنگوں کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے رنگوں کے انسانی نفسیات پر اثرات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ شاہ نے لال رنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں کیوں کہ لال رنگ سندھ کی ثقافت کا ایک اہم رنگ رہا ہے۔ شاہ لطیفؒ سے پہلے قلندر شہباز بھی لال کرتا پہنتے تھے۔ شاہ حسین بھی مادھو لال حسین کہلاتے تھے اور پھر کاک سے لے کر کربلا تک، لال رنگ ہی ہے۔ ''لال گھوٹ'' سندھی میں بہادر کو بھی کہتے ہیں۔ شاہ لطیفؒ نے لال رنگ کا ذکر کم و بیش نوے (۹۰) ابیات میں کیا ہے جب کہ کالے رنگ کا ذکر بتیس (۳۲) ابیات میں اور سفید، ہرے، خاکی، سنہری، گیڑو (نارنگی) اور زرد رنگ کے ذکر بھی کہیں کہیں ابیات میں کیا ہے۔ تنویر نے نہایت مفکرانہ انداز میں شاہ لطیفؒ کی شاعری کے اس پہلو پر تحقیق کی ہے۔ شاعری میں علامات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تنویر عباسی نے شاہ کی شاعری میں موجود علامات کا مطالعہ نہایت باریک بینی اور محبت سے کیا ہے۔ سندھی کلاسیکی شاعری اور لوک شاعری میں بھی علامتی انداز فکر موجود ہے۔ بودلیئر کائنات کو ''علامتوں کا جنگل'' کہتے ہیں۔ تنویر مختلف دلائل کی روشنی میں، شاعری میں علامات کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے، شاہ لطیفؒ کی شاعری کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

> ''شاہ لطیفؒ کی زیادہ تر شاعری تصوف کے رنگ میں تو ہے پھر بھی اس کو ایک طرف کھینچ کر، ایک جیسے معانی نکالنا اور پھر اس کو قطعی کہنا، شاہ لطیفؒ کے فن کی اہمیت کو کم کرنا اور ان کی علامات کو محدود کرنا بھی ہے۔''

(شاہ لطیف کی شاعری)

علامت شاعری کا اہم کام ہے، عام، فانی اور وقتی اشیاء میں سے لازوال اور ازلی حقائق کو تلاش کرنا اور شاہ لطیفؒ نے فانی اشیاء میں سے لازوال اور وقتی باتوں میں سے ازلی اور آفاقی سچائیوں کو تلاش کر کے ظاہر کیا ہے، اس حوالے سے اگر انہیں شاعرِ علامات کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ تنویر عباسی کا یہ مقالا نہ صرف شاہ لطیفؒ کی علامتی شاعری کا وسیع مطالعہ ہے بلکہ بطور مجموعی علامتی شاعری کو سمجھنے کے سلسلے میں بہت اہم تحریر ہے، جس میں مختلف کتب سے تیس (۳۰) حوالا جات دیے گئے ہیں۔

تنویر عباسی نے ''شاہ جو رسالو'' میں موجود سورماؤں اور سورمیوں کے بارے میں بھی ایک عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ شاہ لطیفؒ سے پہلے سندھی شعراء شاہ کریم، شاہ لطف اللہ قادری، خواجہ محمد زماں کے کلام میں بھی اُن سورماؤں کا ذکر ملتا ہے اور شاہ کے بعد بھی سندھی شاعری میں ان کے تذکرے موجود ہیں لیکن شاہ لطیفؒ نے ان کرداروں کو کچھ ایسے انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کو نہ صرف کلاسیکی حیثیت ملی ہے بلکہ وہ بطور علامت جدید سندھی شاعری کا موضوعِ سخن بنتے رہتے ہیں۔ تنویر ان سورماؤں اور سورمیوں کا

نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجبور اور مفلس طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار اپنے عزم و استقلال اور ہمت سے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔''

(شاہ لطیف کی شاعری۔ ص276)

اپنی اسی رائے کی روشنی میں تنویر نے شاہ لطیفؒ کے بظاہر معذور مگر باہمت کردار ''مورڑو میر بحرؔ'' کا خصوصی مطالعہ ''سُر گھاتو'' کے حوالے سے کیا ہے۔ معذور اور ناتواں ''مورڑو میر بحرؔ''، کلاچی کے خطرناک بھنور میں جا کر مگر مچھ کو مار کر اپنے بھائیوں کا بدلہ لیتا ہے۔ طاقتور دشمن کو صرف علم کے ذریعے مات نہیں کیا جاسکتا۔ علم کے ساتھ عمل بھی لازمی ہے۔ تنویر ''مورڑو میر بحرؔ'' کو ہیمنگوئے کے ''بوڑھا اور سمندر'' کے کردار سے موازنہ کرتے ہوئے تجزیہ کرتے ہیں کہ ہیمنگوئے کے پاس بوڑھے کی مسلسل جدوجہد کا پھل کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن شاہ لطیفؒ کا ''مورڑو میر بحرؔ'' اپنے بھائیوں کی لاش حاصل کر کے، اپنی فتح پر خوش ہوتا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی نظر میں میں ''مورڑو میر بحرؔ'' کی فتح اجتماعی کامیابی ہے۔

تنویر عباسی نے شاہ لطیفؒ کے کلام کا موضوعاتی مطالعہ، نہایت فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ اس ضمن میں معروف ناقدین نے اپنی آرا کا اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہار کیا ہے۔ اکثر معاصرین نے تنویر کے اس تحقیقی کام کی تعریف ہی کی ہے اور اُسے روایتی تحقیقی انداز سے ہٹ کر، منفرد تخلیقی تحقیق قرار دیا ہے۔

''تنویر عباسی سندھی زبان کا پہلا ترقی پسند شاعر ہے، جس نے شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی کی شاعری پر ایک کتاب لکھ کر مکمل کی ہے۔ اس طرح اُس نے ایک پرانی روایت کو توڑ دیا ہے جس کے مطابق آج تک صرف نثر نویس نقاد ہی بھٹائی کے بارے میں لکھتے رہے ہیں۔ اصولی طور پر ویسے یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ بھٹائی چونکہ ایک شاعر ہے اس لیے اُس کے فن کا تجزیہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ تنویر نے نہایت حقیقت پسندی اور سچائی سے لکھا ہے اور ہر قسم کی نعرہ بازی سے پرہیز کی ہے۔ اُس نے بھٹائی کا جدید اور معروضی (آبجیکٹو) مطالعہ کیا ہے، جو اس سے پہلے نظر نہیں آتا۔ آج تک بھٹائی کو صرف الفاظ کی سطح پر عظیم کہا گیا ہے تنویر نے کامیابی سے بھٹائی کو عوامی شاعر ثابت کر کے دکھایا ہے۔ ''شاہ لطیفؒ کی عکسی شاعری'' نامی مقالہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھٹائی، موہنجودڑو ہے جسے اب تک مکمل طور پر ڈسکور (Discover) نہیں کیا گیا۔ یہ باب تنویر کی کتاب کی جان اور اس کی تخلیقی تنقید کا کمال ہے، اس سے پہلے بھٹائی کی شاعرانہ عظمت کے اس پہلو کی

طرف بہت کم ادیبوں نے توجہ دی ہے۔ یہ باب پڑھ کر میرے دل نے چاہا کہ کاش تنویر یہ ساری کتاب، بھٹائی کی عکسی شاعری پر ہی لکھ کر مکمل کرتا۔"

انور پیرزادہ

(ماهوار برسات، کراچی۔ جلد 5 شمارہ۔ص 16)

"تنویر عباسی کی کتاب "شاہ لطیفؒ جی شاعری" بھی ایک اہم کتاب ہے، جس میں تنویر عباسیؔ نے مختلف موضوعات قائم کر کے شاہ لطیفؒ بھٹائی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے شاہ کی شاعری کو دنیا کی مختلف زبانوں کے بڑے شعراء کی شاعری کے مقابلے میں رکھ کر مطالعہ کرنے کی رجحان کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ تنویر عباسی نے شاہ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور موضوعات کے حوالے سے مضامین لکھے ہیں، جو جدا جدا ہوتے ہوئے بھی موضوعاتی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ تنویر عباسی کی یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے شاہ لطیفؒ کی شاعری کے کثیر الجہتی پہلو سامنے آسکے ہیں۔"

سید مظہر جمیل

(جدید سندھی ادب۔ اکادمی بازیافت۔ کراچی۔ 2006۔ص 1079)

"تنقید اور تحقیق کے حوالے سے سندھ میں بہت بڑے نام موجود ہیں لیکن تنویر ان سے علیحدہ اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔ انہوں نے روایتی انداز میں تحقیق کرنے کے بجائے معروضی حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے، دنیا کے ادب سے تقابلی مطالعہ کے ذریعے، سندھی ادب کو پرکھنے کی روایت رکھی۔ اُنہوں نے یورپ کے کلاسیکی و رومانوی معیاروں پر "شاہ لطیفؒ کی شاعری" اپنی مثال آپ ہے، جس میں انہوں نے، شاہ کی عوامی شاعری، موسیقیت، عکسیت، سماجی و اخلاقی اقدار، علامات و دیگر پہلوؤں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ شاہ لطیفؒ کی سورمیوں کے بارے تنویر کا ایک اپنا علیحدہ نظریہ تھا، جو ترقی پسند اور جدید فکر سے ہم آہنگ تھا۔ جب سندھ میں "عورت ذات" (Feminism) تحریک کا نام و نشان تک نہ تھا، تب تنویر عباسی نے، شاہ لطیفؒ کی شاعری میں عورت کے آدرشی کردار کی بات کی تھی۔"

ڈاکٹر فهميده حسين

(ڀٽائي ريسرچ جرنل. 7، شعبه سنڌي، شاه لطيف يونيورسٽي، خيرپور، 2002ع. ص. 23)

''ڈاکٹر تنویر عباسی کی کتاب ''شاہ لطیفؒ کی شاعری'' 1976ء سے لے کر علماء، ادیب و شاگرد شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے آرہے ہیں۔ شاہ لطیفؒ پر ویسے تو کئی دانشوروں اور محققوں نے اچھا خاصا کام کیا ہے لیکن تنویر کے نقطۂ نظر سے، شاہ کو سمجھنے کے بعد ہمارے ذہن میں شاہ کا کردار و مزاج بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالات، دیگر علماء کی تحقیق سے مختلف ہیں۔ تنویر نے ایک نقاد کی نظر سے برصغیر کے مفکرین اور دانشوروں کے نظریات اور ان کی فنی مہارت کو سامنے رکھتے ہوئے، شاہ کے فن کو کمال کے درجہ تک پہنچادیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تنویر عباسی کی یہ کتاب شاہ لطیفؒ کے فکر و فلسفے کی وصف ہے، جس میں ہر موضوع پر بحث کی گئی اور نتائج حاصل کیے گئے ہیں۔ شاہ کی نسبت، سندھی ادب میں اس قسم کی ایک دو کتابیں ہی ملتی ہیں۔ شاہ لطیفؒ کے کلام پر کون سے عالم نے سب سے بہتر کام کیا ہے، سوال یہ نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ آج کے جدید دور میں ذہن کون سی بات قبول کرتا ہے۔''

طارق عزيز شيخ

(ڀٽائي جرنل تنوير عباسي نمبر 7، شعبه سنڌي، شاه لطيف يونيورسٽي، خيرپور، 2002، ص. 15 8)

بطور محقق

تنویر عباسی کا کیا ہوا تحقیقی کام، سندھی ادب کا ایک اہم سرمایہ ہے۔ انہوں نے روایتی انداز تحقیق ترک کر کے، نئے تحقیقی زاویوں سے بکھرے ہوئے ادب کو یکجا کیا اور پھر اپنے عالمانہ اور مفکرانہ نقطۂ نظر سے ان کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور فکر انگیز مقدمات تحریر کیے۔ وہ شاہ، سچل اور سامی کے تو عاشق تھے لیکن دیگر کلاسیکی شعرا سے بھی اُن کی عقیدت اپنی مثال آپ ہے۔ سچل سرمست کے وہ شیدائی تھے۔ نہ صرف اپنے قلم سے انہوں نے سچل کے افکار کو عام کیا بلکہ ادبی کانفرنسوں اور ادبی انجمنوں کے ذریعے عملی طرح بھی سچل سرمست کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کاوشیں کیں۔ سچل یادگار کمیٹی، سچل چیئر اور دیگر اداروں کی معرفت انہوں نے سچل سرمست کے کلام کو اُجاگر کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے "سچل سائیں"، "خاموش رہوں تو مشرک"، "سچل سرمست اور عروضی شاعری"، "تصوف اور سچل سرمست (انگریزی میں)"، "سچل سرمست"، "سچل سرمست کے سندھی اور سرائیکی شاعری پر اثرات" کے موضوعات پر مقالات و مضامین لکھے، جو سچل شناسی کی نسبت سے ایک بڑا اور نمایاں کام ہے۔ شاہ لطیف کا اسلوب، علامتی اور گہرا ہے، لیکن سچل سرمست کا اسلوب اُن سے جداگانہ، واضح، بیباک اور گھن گرج والا ہے۔

"سچل سرمست" کے عنوان سے تنویر عباسی نے ایک کتاب انگریزی زبان میں ایڈٹ کی تھی، جسے سچل چیئر شاہ لطیف یونیورسٹی خیر پور نے شائع کیا۔ ایڈیٹر نوٹ میں وہ لکھتے ہیں:

> "سچل سرمست کے بارے میں انگریزی زبان میں زیادہ نہیں لکھا گیا لیکن جو بھی لکھا گیا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے سچل کے بارے میں لکھے گئے مضامین (1924ء سے لے کر آج تک) جمع کیے، جو مختلف ممالک میں شائع ہوئے ہیں۔" (ص۔8)

اس کتاب میں آٹھ مضامین و مقالات ہیں، جو تصوف اور سچل سرمست کے افکار کے بارے میں ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے۔

1۔	سندھ کا عطار	ڈاکٹر اینمیری شمل
2۔	سچل کا مرکزی خیال	ڈاکٹر سی شیکل

3۔	سچل	جیٹھ مل پرسرام گلراجانی
4۔	صحرا کی آواز	ٹی ایل واسوانی
5۔	ن۔م	گردیال ملک
6۔	سچل۔شاعر انقلاب	پروفیسر ایل۔ایچ اجوانی
7۔	صوفی ازم۔سچل اور اُس کے گرد کی دنیا	امر جلیل
8۔	تصوف، سندھ اور سچل	تنویر عباسی

ان آٹھ مقالات میں سے ابتدائی چھ مقالات، شائع شدہ تھے، جنہیں تنویر عباسی نے، تحقیق کر کے جمع کیا۔امر جلیل اور تنویر عباسی کے مقالات بعد میں لکھے گئے تھے۔تنویر نے اپنے مقالے"تصوف، سندھ اور سچل"میں، مختصر الفاظ میں تصوف کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے اور پھر سندھ میں تصوف کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سچل سرمست کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔تنویر لکھتے ہیں:

"Sachal appears as a fearless out spoken, exponent of Pantheism, a tireless preacher of love and humanity. A bold fallower of Mansoor Hillaj. He did not want to be one of the crowd, but, he wanted to be a leader

Book: "Sachal Sarmast". Page No: 97.

☆

جتي ماڻهن ميڙُ اتي آهُ ناهيان

سسي سنبا هيان ،پنڌ شاهه حلاج جي

جہاں ہے ہجوم، وہاں میں نہیں ہوں

مجھے ہے معلوم، راستہ شاہ حلاج کا

لطیف شناسی کے حوالے سے تنویر عباسی نے جو اعلیٰ اور اہم تحقیقی کام سرانجام دیا تھا، اس کا علیحدہ عنوان کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ تنویر عباسی نے اپنے آس پاس کے دو صوفی شعراء نانک یوسف اور خوش خیر محمد ہیسبانی کے بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کر کے ترتیب دیا تھا، وہ بھی قابلِ تحسین تحقیقی کارنامہ ہے۔ان دونوں کتابوں کو سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا تھا۔ان شعراء کا کلام اردو (ہندی) سرائیکی اور سندھی زبان میں ہے۔نانک یوسف (1792تا1853) کا کھوکھر قبیلے سے تعلق تھا، ان کے والد محمد ہاشم اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔مدرسہ میں عربی و فارسی کے ساتھ دینی علوم پڑھاتے تھے۔روایت ہے کہ نانک یوسف مجل مگسی سے رانی پور اپنے مرشد سید صالح شاہ سے ملاقات کے لیے

آئے تو اُن کی بچل سرمست سے شناسائی ہوئی۔ وہ اُن کے رنگ میں رنگ گئے اور وہیں اپنا مسکن بنالیا۔ نانک یوسف نے بچل سائیں کو اپنا رہبر بنایا اور ان کی رہنمائی میں خود شناسی سے خدا شناسی کی منزل تک رسائی حاصل کرلی۔ ان کے افکار پر بچل سرمست کا اثر نمایاں ہے۔ ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ یوسف، بچل سائیں کے فرمان پر امرتسر گئے تھے کہ بذریعہ پیغامِ تصوف، مسلمانوں اور سکھوں کو ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب لاکر صوفیانہ افکار کو عام کیا جاسکے۔ بچل سرمست نے اس حوالے سے ان کو "نانک" کا لقب عطا کیا تھا۔

تنویر عباسی نے نانک یوسف کا کلام، آٹھ سے زائد قلمی نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا اور ان کی شخصیت و افکار کے بارے میں انسٹھ صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھ کر ایک اہم تحقیقی کام سرانجام دیا ہے۔ نانک یوسف کے کلام میں بیت، کافیاں اور دوہے شامل ہیں جو سندھی اور سرائیکی میں ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی اور ریختہ میں کچھ کلام موجود ہے۔

خوش خیر محمد ہیسانی (1809 تا 1877) بھی اپنے وقت کے ایک قادر الکلام شاعر تھے، جو مشہور شاعر عثمان سانگی کے دوست تھے اور نانک یوسف سے بھی ان کے مراسم تھے۔ بچل سرمست چونکہ اس دور کے بہت بڑے اور اہم شاعر تھے، اس لیے ان کے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء پر ان کے گہرے اثرات ہیں اور ان اثرات سے خوش خیر محمد ہیسانی بھی فیض یاب ہوئے۔

کافی کی صنف پر انہیں زیادہ دسترس حاصل تھی۔ اُن کی یہ کافی دیگر کئی کافیوں کی طرح مقبول ہے۔

رخ رانجھن، ماہ منیر ہویا
ساڈا دم دم ساہ سد ھیر ہویا

تنویر عباسی کا اندازِ تحقیق دیگر محققین سے مختلف و منفرد ہے۔ اُس کی وجہ اُن کا شاعر ہونا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے خوش خیر محمد ہیسانی کا نہ صرف کلام بلکہ ان کی سوانح کے بارے میں قابلِ ذکر مواد جمع کیا اور روایت چھان بین کر کے ساٹھ صفحات کا مقدمہ تحریر کیا۔ جو کہ ایک بڑا محنت طلب کام ہے۔ ان دونوں صوفی شعراء کا کلام تنویر عباسی کی تحقیقی کاوشوں کے بدولت پہلی بار منظرِ عام پر آیا۔

تنویر عباسی نے ابتدا میں بچوں کے لیے کچھ گیت بھی لکھے تھے، جو ریڈیو پاکستان حیدرآباد نے ریکارڈ بھی کیے تھے لیکن وہ محفوظ نہ ہو سکے۔ بچوں کی شاعری سے انتخاب کے سلسلہ میں تنویر عباسی نے "بچوں کے بول" کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی تھی، جسے انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی جامشورو نے 1975ء میں شائع کیا تھا۔ ادارہ کی طرف سے شعراء کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ بچوں کے لیے دلچسپ گیت اور نظمیں لکھیں۔ شعراء کی ارسال کردہ شاعری میں سے انتخاب کر کے کشنچند بیوس، نثار بزمی، ہوندراج دکھایل، اُستاد بخاری، احمد خان آصف اور نادم بچل شاہی کے کلام کو کتاب میں شامل کیا گیا تھا۔ بچوں کے لیے یہ ایک مختصر صفحات پر مشتمل کتاب تھی لیکن اس میں شامل انتخاب بچوں کی نفسیات اور

پسند کے پیشِ نظر کیا گیا تھا اور وہ کتاب اُس زمانے میں، جب سندھی میں بچوں کے لیے نظموں کی کتابیں کم دستیاب تھیں، بہت مقبول ہوئی تھی۔

''سندھ کے عظیم صوفی بزرگ'' کے نام سے لکھی گئی کتاب بھی تنویر عباسی کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ ان کو سندھ کے صوفی شعراء و بزرگان کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا شوق ہمیشہ رہتا تھا۔ سچل چیئر جیسے تحقیقی مرکز سے وابستگی کی بنا پر بھی اُنہیں ایسا مواد حاصل کرنے کی جستجو رہتی تھی۔ اس کتابچے میں قلندر لعل شہباز، سچل سرمست، صوفی شاہ عنایت اور دیگر صوفیائے کرام کے بارے میں بھی مواد شامل ہے۔

سندھی ادبی بورڈ نے 1981ء میں تنویر عباسی کی مرتب کردہ کتاب ''جدید سندھی شاعری'' شائع کی تھی۔ اس کتاب میں بیسویں صدی کے جدید ترقی پسند شعراء کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ تنویر نے کشنچند بیوس، بردو سندھی، شیخ ایاز، امداد حسینی، نیاز ھمایونی، سرویچ سجاولی سے لے کر ایاز گل اور ماٹھیو بجھوتے نئی نسل کے شعراء کے کلام کو منتخب کر کے اس کتاب میں یکجا کیا ہے۔

تنویر عباسی کا تحقیقی انداز، روایتی تحقیق سے ہٹ کر نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک منفرد محقق تھے، جن کا مطالعہ اپنے معاصرین سے زیادہ تھا۔

> ''تنویر عباسی ایک بڑے شاعر تھے اور اُس کے ساتھ سندھی کلاسیکی شاعری کا مستند محقق بھی تھے۔ اُن کی تحقیق، سندھی، فارسی اور فرینچ زبانوں کی شاعری کے متعلق تھی۔ وہ شاہ لطیفؒ، سچل سرمست، سامی اور دیگر کلاسیکی شعراء اور نئے لکھنے والوں کے فن کے بارے میں کسی مواد کے بغیر گھنٹوں بات کر سکتے تھے۔ تنویر کے جلائے ہوئے چراغ ابھی بجھے نہیں ہیں۔ اُن کے فکر کی خوشبو ہمیشہ رہے گی۔''

ڈاکٹر سلیمان شیخ

(مهران۔ تنویر عباسی نمبر۔ 2000ء، ص۔ 155)

> ''ایک محقق کی حیثیت سے تنویر عباسی ایک کامل محقق تھے۔ جدید تحقیق کے حوالے سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شاہ لطیفؒ پر گربخشانی، علامہ آئی آئی قاضی، سادھو ٹی ایل واسوانی، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، الھدا و بوہیو اور دیگر علماء کی تحقیق اپنی جداگانہ اور بلند حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن تنویر عباسی کا رنگ منفرد اور تخلیقی تھا۔ ان کی تحقیق چاہے خوش خیر محمد ھیسبانی کے کلام پر ہو یا نانک یوسف سے لے کر سچل سرمست کے کلام تک ہو، اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ وہ حوالہ جاتی محقق نہ تھے لیکن جدت طرازی، انفرادیت، توازن اور تخلیقیت، ان کی تحقیق کے بنیادی جوہر تھے۔ وہ جتنے معتبر دوست تھے اتنے ہی معتبر دانشور بھی تھے۔''

تاج جویو

سفرنامہ

سندھی ادب میں سب سے زیادہ سفرنامے لکھنے کا اعزاز الطاف شیخ کو حاصل ہے، جس نے پچاس سے زائد ممالک کے سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، ماہتاب محبوب، سلیم قریشی، عمر قاضی، عبدالحئی پلیجو، محمد خان سیال، فہمیدہ حسین، عنایت بلوچ، طارق عالم ابڑو اور دیگر مصنفین نے بھی سفرنامے لکھے ہیں، لیکن انفرادیت کے حوالے سے تنویر عباسی کے سفرناموں کا ایک علیحدہ اسٹائل ہے۔ تنویر کی اس خوبی کی وجہ سے طارق اشرف کو لکھنا پڑا کہ:

''تنویر کے سفرنامے کے بعد اب جو بھی باہر سے آکر لکھے گا اُسے تنویر کے سفرنامے کی خوبیوں کو سامنے رکھنا پڑے گا۔'' (ص۔8)

تنویر عباسی کا پہلا سفرنامہ (ڏوري ڏوري ڏٺم) ''گھوم کے دیکھی دنیا'' تھا۔ 1979 میں تنویر نے اپنی ہم سفر ڈاکٹر قمر کے ساتھ یورپ کی سیر کی تھی، جسے انہوں نے قلم بند کیا اور طارق اشرف نے اپنے ادارے سمنی پبلیکیشن کی طرف سے اُسے 1984ء میں شائع کیا۔ 233 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے کا انتساب تنویر نے اپنے فرینچ استاد کیس ڈی گروٹ (Cese de Groote) اور اس کی بیوی لکی (Lookie) کے نام کیا تھا۔

یہ ایک شاعر کا لکھا ہوا دلچسپ سفرنامہ ہے جو زبان کی شیرینی اور رنگینی کی وجہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پورے سفرنامے کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جیسے ایتھنز میں چار چشمی، روم شہر میں نیپلس اور کیپری، لندن نیشنل آرٹ گیلری، برٹش میوزیم، مادام تساؤ، ڈاکٹر شنکل سے ملاقات، دل کی بات، شاپنگ، لیسٹر کی طرف، کنگس لین، لیسٹر میں یادگار رات، شیکسپیئر کا شہر، پوئٹری سوسائٹی، ڈاکٹر آکچن، ایمسٹرڈم، ہالینڈ، پیرس اور پھر ایتھنز۔ تنویر نے ان شہروں اور مناظر کو جمالیاتی شعور رکھنے والے ایک نفیس اور حساس شاعر کی آنکھ سے دیکھ کر جو منظر نگاری کی ہے، وہ دل کو چھو لیتی ہے۔ ایتھنز پہنچ کر ابھی وہ جہاز سے اُترے نہیں ہیں لیکن وہ شہر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایتھنز میں جیسے گدگدی سی ہونے لگی، سقراط کا ایتھنز، ہومر کا ایتھنز، افلاطون

کا ایتھنز، سیفو کا ایتھنز، وہ شہر جس کی ہر گلی میں، وینس جیسی حُسن کی دیویاں
گھومتی ہوں گی۔ جس کی ہر گلی میں، ہومر کی طرح شاعر شعری سُناتے ہوں
گے۔ جہاں مارکیٹ چوک پر سقراط سوال جواب کرتا ہوگا۔ میں نے جہاز کی
کھڑکی سے باہر جھانک کر سرمئی سمندر کے ساتھ جھلملاتی بتیاں، جیسے کوئی خواب
ہو، جیسے کلپنا ہو کسی شاعر کی، جیسے کسی سودائی کی سوچ ہو۔'' (ص۔12)

روم میں جب تنویر مسولینی کے ہیڈ کوارٹر پہنچتا ہے تو اُس کے انسان دوستی والے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ قومی برتری کی سوچ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے:

''اس جگہ پر کھڑا ہو کر مسولینی تقاریر کرتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اٹلی کا
ڈکٹیٹر فاشزم کا خالق، ہٹلر کا ہم نوا۔ ہٹلر نے جرمن قوم سے کہا،''تم سب سے
بہتر قوم ہو۔'' اور جرمنی تباہ ہوا۔ وہی بات مسولینی نے اٹلی والوں سے کہی۔ اٹلی
تباہ ہوا۔ تاریخ میں شہید اور مجاہد بننے کی لالچ میں قتل و خون کے لیے اُکسانے
والوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کوئی بھی قوم برتر نہیں ہے، کوئی بھی قوم کم تر نہیں
ہے۔ جن قوموں نے اپنی برتری کے دعوے کیے ہیں، اس صدی میں ان کی
عورتیں بیوہ، مائیں بے اولاد اور بیٹیاں بازار کی زینت بنی ہیں۔ قومی احساسِ
برتری والوں کے لیے یہ سزا ہے، جو اس صدی میں دنیا کی ان اقوام کو ملی جو
ماضی میں عظیم تھیں اور جن کے ثقافتی ورثہ کو دنیا نے تسلیم کیا تھا۔ کوئی بھی قوم کم تر
نہیں ہے، کوئی بھی قوم برتر نہیں ہے۔ کوئی بھی قوم برہمن نہیں ہے، کوئی بھی قوم
شودر نہیں ہے۔ یہ صدی اونچ نیچ اور قوموں کے درمیاں فرق کو ختم کرنے کی
صدی ہے۔ یہ صدی تعصب کی قاتل صدی ہے۔'' (ص۔22)

نیپلس، اٹلی کا حسین ساحلی شہر ہے۔ قمر اور تنویر بذریعہ لانچ نیپلس سے کیپری جزیرہ پہ جاتے ہیں جو کہ نیلے سمندر اور نیلے آسمان کے بیچ ایک بڑا پہاڑی جزیرہ ہے۔ تنویر جب کیپری کی خوبصورتی دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''میں نے سوچا، تاریخ کیا بھی ہو، یہ شہر کس نے بھی بنایا ہو اور کون سے بھی بادشاہوں
کا اس پر قبضہ رہا ہو، وہ سب سچ ہے لیکن ان سب سے بڑا سچ ہے کیپری کا حسن۔ اس
حسن کو رہنے دو، اس حسن کو تباہ نہ کرو۔ انسان کو آنکھیں ٹھنڈی کرنے دو۔ خوابوں کے
اس جزیرے پر دل کے سارے گمان بھول جاتے ہیں اور سب یہ بھی بھول جاتے ہیں
کہ ٹورسٹس میں سے کون عرب ہے، کون فرانسیسی ہے، کون کالا ہے یا گورا۔ کون
یہودی ہے اور کون مسلمان۔'' (ص:52)

اندازِ تحریر سے کسی بھی لکھاری کے نظریات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، سفرنامہ ہو، ناول یا افسانہ مصنف کے اپنے ذاتی احساسات کی جھلک ان میں ضرور نظر آتی ہے۔اس سفرنامے میں تنویر کا صوفیانہ مزاج، انسان دوستی، نزاکت، نفاست، حسن پرستی اور بین الاقوامی بھائی چارہ جگہ جگہ جھلکتا ہے۔قاری اس سفرنامے سے تنویر عباسی کی شخصیت اور ان کے رجحانات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا۔

تنویر عباسی جب مادام تساؤ کے مجسمات کو دیکھتا ہے تو وہاں بھی ان کا تحریری انداز ایک منفرد، روشن خیال دانشور جیسا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"اگر محمود غزنوی یہ بت خانہ دیکھتا اور اس میں حسن جمالیات (Asthetic Sense) ہوتی تو شاید بت شکنی سے توبہ کرتا۔ان بتوں کو توڑنے کے لیے کسی ہتھوڑے یا تیشے کی ضرورت نہیں۔انہیں ہاتھ لگاؤ تو پگھل جاتے ہیں۔کیونکہ یہ موم کے بت ہیں، سنگِ مرمر کے نہیں۔فیض کا شعر ہے:

جیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

(ص۔80)

ہر سفرنامہ نویس کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے اور وہ ان مقامات کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے مزاج کے مطابق ان کو اچھے لگتے ہوں گے اور ان شخصیات سے ملنا چاہتے ہوں گے، جن سے ان کی کچھ ذہنی ہم آہنگی ہو۔ڈاکٹر تنویر عباسی، لندن میں ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل سے ملنا پسند کرتے ہیں جو کہ یونیورسٹی میں آفریقی، ایشیائی اور ہندوستانی شعبہ کے اسکالر اور پنجابی اردو اور سرائیکی زبانوں کے ماہر ہیں۔تنویر، ڈاکٹر شیکل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب وہ اُن سے ملنے خیر پور ان کے گھر آئے تھے، تو انہوں نے اسے اپنے ذاتی کتب خانہ میں سچل کا سرائیکی کلام، دیوانِ بیدل، کلیاتِ سچل دکھائے تھے تو ڈاکٹر شیکل نے کہا تھا کہ یہ سب کتابیں اُس کی پڑھی ہوئی ہیں اور اُس کے ذاتی کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔تنویر عباسی اُس بات سے کافی متاثر ہوئے تھے۔

لندن کے سفر میں تنویر نے ڈاکٹر شیکل سے ملاقات کی اور وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے کافی دیر تک سندھی اور سرائیکی ادب کے بارے میں گفتگو کی۔

تنویر عباسی جب ٹیمس ندی کے کناروں پر خوبصورتی کو دیکھتے ہیں تو انہیں سکھر کا بندر روڈ، حیدرآباد کی پھلیلی کے کنارے اور میرواہ خیر پور یاد آنے لگتے ہیں اور وہ حسرت کرتے ہیں کہ کاش ہمارے دیس کی وہ خوبصورت جگہیں، ٹیمس ندی کے کناروں کی طرح دلفریب بنائی جاتیں۔

تنویر عباسی لندن کی پوئٹری سوسائٹی کی میٹنگ میں بھی شرکت کرتے ہیں اور سوسائٹی کی ممبر شپ بھی

لیتے ہیں۔سوسائٹی کی جانب سے جاری کردہ ''پوئٹری'' اور ''پوئٹری ریویو'' مخزن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کی تنظیم وترتیب دیکھ کر لکھتے ہیں:

''پوئٹری سوسائٹی کی میٹنگ میں شریک ہو کر میں نے محسوس کیا کہ ہم نہ صرف سائنس وٹیکنالوجی میں یورپ سے پیچھے ہیں بلکہ ادب وشاعری میں بھی۔ پتا نہیں کب یہ فاصلہ طے کر سکیں گے۔'' (ص۔141)

تنویر اور ڈاکٹر قمر ہالینڈ صرف لگی اور کیس کی خاطر جاتے ہیں۔کیس ڈی گروٹ نے خیر پور میں تنویر کو فرنچ زبان سکھائی تھی۔وہ صرف ان سے ملنے کی خاطر اُنکے شہر ڈین ہیگ (Den Haigue) جاتے ہیں اور اُن سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔وہ نیشنل آرٹ گیلری اور برٹش میوزیم بھی جاتے ہیں اور وہاں کی ہر چیز کا الفاظ میں پورٹریٹ بناتے ہیں۔

تنویر، فرانس کی بھی تعریف کرتے ہیں۔وہ وہاں کے آرٹ، میوزیم اور خوب صورتی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''موسیقی ہو یا ڈرامہ، فیشن ہو یا خوشبو، فرانس ساری دنیا سے آگے ہے۔آزاد نظم کی ترقی فرانس میں ہوئی۔تجریدی مصوری کا ارتقاء اس سرزمین پر ہوا۔جدید ترین فلسفی اور وجودیت کا عالمی شہرت یافتہ مفکر، نقاد اور دانشور ژال پال سارتر بھی اس مٹی کا تھا۔فرانس تیری دھرتی کو سلام، تیرے آسمان کو سلام، تیرے سوپیاں، ردوسو، والیئر ، بودلیئر، ملارے، رامبو، پکاسو، سینٹ جان پرس، سارتر سب کو سلام۔'' (ص۔191)

تنویر عباسی کو سیاحت سے بہت دلچسپی تھی۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ساری دنیا گھومتے۔انہوں نے یورپ اور امریکا کی بھی سیر کی اور اُس رنگین وحسین سفر کی روداد قلم بند بھی کی لیکن افسوس کہ وہ سفر نامہ، ان کی وفات کے بعد 2000ء میں'' آگے جانا ہے مجھے'' کے نام سے شائع ہوا۔'' گھوم کے دیکھی دنیا'' کی طرح اس سفر نامے میں بھی تنویر نے دلچسپ انداز تحریر اختیار کیا ہے اور پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان کے ہم سفر ہیں اور وہ ہمارا ہاتھ تھامے مختلف مقامات کی سیر کروا رہے ہیں۔نیو یارک، نیاگرا آبشار، پرنسٹن، واشنگٹن، میامی، لاس اینجلز، سان فرانسسکو، نیو جرسی، ہالینڈ، استنبول اور دیگر مقامات کے بارے میں شاعرانہ انداز میں لکھا ہے۔وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں، اپنے دیس کو ضرور یاد رکھتے ہیں۔نیاگرا آبشار گھومتے وقت اُن کی ملاقات ایک ستر سالہ بوڑھے امریکی ٹیکسی ڈرائیور سے ہوتی ہے، جسے اپنے کام سے لگن ہے۔تنویر لکھتے ہیں کہ کاش سندھ کا ہر آدمی، اس بوڑھے امریکن سے سبق سیکھے جو اپنے کام سے پیار کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔لائبریری آف

کانگریس کا شمار دنیا کی بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔اس کمپیوٹرائزڈ لائبریری کا مشاہدہ کرتے وقت، تنویر لائبریری کا سندھی شعبہ خصوصی طور پر دیکھتے ہیں۔ جہاں سندھی کتب، اخبارات، مخزن، پمفلٹ وغیرہ سب محفوظ ہیں۔ کچھ ایسی نادر کتب بھی موجود ہیں جو سندھ میں نہیں ہیں۔ سندھی مواد نہ صرف لائبریری آف کانگریس میں محفوظ ہوتا ہے بلکہ وہ امریکا کی دیگر گیارہ یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔"عالمی شاعری کے نوادارات" کے سلسلے میں تنویر عباسی کی سندھی شاعری، ان کی آواز میں ریکارڈ کر کے، انگریزی ترجمہ کے ساتھ لائبریری میں محفوظ کی گئی ہے۔تنویر جب لائبریری میں جنوبی ایشیائی شعبے کے انچارج لوئی جیکب سے ملتے ہیں تو وہ انہیں نام سے پہچانتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی کتابیں اس سیکشن میں موجود ہیں۔تنویر جب وہ کتابیں دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ وہاں شاہ جو رسالو، جی ایم سید، غلام نبی مغل اور ان کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔

تنویر عباسی جب سان فرانسسکو جاتے ہیں تو سب سے پہلے بے برج (Bay Bridge) دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔وہ پل انجینئرنگ کے فن کا ایک شاہکار ضرور ہے، لیکن تنویر اس پل کو امریکی شاعر کارل سینڈبرگ کی وجہ سے پہچانتے ہیں، جس کی یہ نظم انہوں نے 1954ء میں پڑھی تھی۔

O God

Put me on evil

Strike me with hammer

Turn me to steel bar

Which is holding the bridge of Sanfransisco

تنویر بینچ پر بیٹھ کر، نیلے سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے، پارس، ماری اور سرمد کو پاس بلاتے ہیں اور پل کی طرف اشارہ کر کے، انہیں کارل سینڈبرگ کی نظم سناتے ہیں۔

تنویر اپنے محبوب بیٹے سرمد کے گھر، جو کہ امریکی ریاست نیو جرسی کے ہائی لینڈ پارک شہر میں تھا، جاتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"سرمد کے گھر پہنچ کر ایسا لگا جیسے میں اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر پھل کھا رہا ہوں۔" (ص۔98)

خیرپور میں بھی سرمد کا گھر میرواہ کے کنارے تھا اور امریکا میں بھی اس کا گھر رارٹین ندی کے کنارے تھا۔
تنویر عباسی، اپنے بیٹے سرمد کے ساتھ کئی میلوں میں پھیلی ہوئی، رٹگرس یونیورسٹی بھی جاتے ہیں جہاں سرمد زیر تعلیم تھے۔

کتابوں کے حوالے سے تنویر لکھتے ہیں کہ سارے امریکا میں پرانی کتابوں کی دو کمپنیاں پرمنڈ

(Pyramid) اور چیپٹر ون (Chapter One) کے نام سے ہیں، جن کی برانچیں ہر شہر میں ہیں۔ تنویر اُس کتاب مرکز پر جاتے ہیں، جہاں کافی شاپ بھی تھا اور ہر ہفتے "شامِ شاعری" بھی منعقد ہوتی ہے۔ وہ کچھ کتابیں خرید کر، "شامِ شاعری" کی نشست میں شریک ہوتے ہیں اور مختلف شعراء کا کلام سُنتے ہیں۔ جب ایک نوجوان شاعرہ، فحش شاعری پیش کرتی ہیں، تو تنویر کو اچھا نہیں لگتا، اور اُن کا جدید امریکن شاعری سے یقین اُٹھ جاتا ہے۔ بقول تنویر وہ اشعار اتنے بے ہودہ اور فحش تھے کہ وہ لکھ نہیں سکتے۔

اس سفرنامے میں اُس کے بعد رووڈن میوزیم، اٹلانٹک سٹی، فلم، وڈیو کیسٹس کا ذکر آتا ہے۔ جب وہ کیسٹس کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کو ممتاز مرزا یاد آتے ہیں، جنہیں انہوں نے کہا تھا کہ شاہ لطیفؒ کے سارے رسالے کی وڈیو فلم، ٹی وی پر اقساط میں دکھائی جائے۔ وہ نیو یارک کے، راکفیلر سنٹر، سنٹرل پارک، یونائیٹڈ نیشن بلڈنگ وغیرہ دیکھتے ہیں۔ سرمد کے دوستوں سے ملتے ہیں، جن میں سے آندرے سریدی، رنیش، علی اور رنکو کا ذکر کرتے ہیں۔ رنکو کو وہ ٹیگور کی دھرتی کی بیٹی لکھتے ہیں۔ (رنکو، سرمد کی دوست ہے، بعد میں آگے چل کر، سرمد نے اُن سے شادی کر لی)۔

اس سفرنامے میں تنویر، امریکا جاتے ہوئے کچھ وقت استنبول ٹھہرتے ہیں اور وہاں کے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہیں، جیسے نیلی مسجد، سینٹ صوفیہ میوزیم، ٹوپکاپی میوزیم (جسے وہ میوزیم نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی دنیا لکھتے ہیں) مقدس گیلری وغیرہ۔ سرمد جب استنبول گئے تھے تو، تنویر کو نیلی مسجد کا ویو کارڈ بھیجا تھا، اور کارڈ میں لکھا تھا:

"ترک واقعی سیکیولر ہیں، اُن کے ہاں مسجد کے ساتھ ہی شراب ملتی ہے۔"

تنویر عباسی جب مسجد کے پاس شراب ملنے کا منظر خود دیکھتے ہیں تو انہیں غالب کا یہ مصرع یاد آتا ہے:

'مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

"گھوم کے دیکھی دنیا" کی طرح یہ سفرنامہ "آگے جانا ہے مجھے" بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے اور قاری اُس میں گم ہو جاتا ہے اور کہیں بھی اُسے بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

تنویر عباسی کا تیسرا سفرنامہ دبئی کا ہے۔ "دو ٹکڑے چاند" کے عنوان سے لکھا گیا یہ سفرنامہ نہایت جذباتی اور احساساتی ہے کیوں کہ کئی سالوں کے انتظار کے بعد وہ اپنے اُن دوستوں سے ملنے جاتے ہیں، جن سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ شعر و ادب سندھ، سندھی زبان کے حوالے سے ایک رشتہ تھا۔ وہ، اُس موتی پرکاش سے ملنے جاتے ہیں، جنہیں بچپن میں وہ بچوں کے مخزن "بال سندیش" میں پڑھتے ہیں اور پھر بعد میں 1980ء میں کراچی میں ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اپنے آئیڈیل شاعر نارائن شیام سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ دبئی ایئرپورٹ پر جب موتی پرکاش اور نارائن شیام دونوں تنویر کا استقبال کرنے آتے ہیں تو تنویر ان احساسات کو بیان نہیں کر پاتے، وہ لکھتے ہیں کہ کاش اُسے دو جسم اور چار بانہیں

ہوتیں تو وہ بیک وقت دونوں سے گلے ملتے۔ وہ کافی دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہوئے روتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ تنویر ملاقات کی اس حقیقت کو، سپنے سے خوب صورت تصور کرتے ہیں۔ تنویر موتی پرکاش کے گھر کی سجاوٹ کی تعریف کرتے ہیں، جہاں ان کے ذاتی لائبریری کو دیکھ کر تنویر، موتی سے کہتے ہیں کہ انہوں نے سارے سندھ کو یہاں جمع کر رکھا ہے۔ قمر تنویر، ہوٹل میں جب نارائن شیام کو اجرک اور سندھی ٹوپی پہناتی ہیں تو نارائن شیام کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ دبئی میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تنویر اور نارائن شیام اپنی علیحدہ محافل سجاتے ہیں، ایک دوسرے کو اپنی شاعری سُناتے ہیں۔ ایک ایسی ہی محفل میں جب نارائن شیام وطن سے ہجرت کے حوالے سے یہ شعر پڑھتے ہیں کہ:

وہ کون سی گھڑی تھی کہ شیام وہاں سے نکلے تھے
وطن لوٹنا تو کیا سرحد دیکھنا نصیب نہ ہوئی

تو سب کے دل بھر آتے ہیں۔ وہ اپنے آنسو ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں۔ تنویر دبئی گھومتے ہیں، وہاں کے شاپنگ سینٹرز کی تعریف کرتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر اُن کا یہ سفرنامہ ایک علمی، ادبی اور دوستی کا سفرنامہ ہے۔ دبئی کی ہر شام ان کے لیے نیا رنگ اور احساسات کی بہار لاتی ہے۔ ایسی ہی ایک یادگار شام کو تنویر عباسی یہ ہائیکو لکھتے ہیں:

ھائیکو

یہ دبئی کی شام
میرے سامنے آئینہ
یہ نارائن شیام

تنویر اپنے میزبانوں کے ساتھ عرب امارات کے ایک اور شہر العین بھی جاتے ہیں۔ وہ العین یونیورسٹی کے پاس گزرتے ہوئے تعلیم کی طرف عربوں کے رجحانات کی تعریف کرتے ہیں۔ عربوں کے لیے تعلیم مفت ہے، اس کے علاوہ ہاسٹل کا خرچہ، لباس، خوراک، کتابیں سب مفت ہیں۔ جن کے بچے پڑھتے ہیں ان والدین کو بھی الاؤنس دیا جاتا ہے۔

تنویر عباسی کا دبئی کا یہ سفر 11 مارچ 1986ء کو اختتام پذیر ہوتا ہے، بقول تنویر یہ جدائی کی تاریخ تھی۔ دبئی میں تنویر کی ملاقاتیں موتی پرکاش، کلا پرکاش، نارائن شیام، گوپ کمل، عطا سندھی، گوردھن شرما، موھن گیہانی، واسو یوموھی، رام بخشانی اور دیگر دوستوں سے ہوتی ہیں۔ اُس آخری تاریخ کو موھن، ''رچنا'' مخزن کے لیے تنویر کا انٹرویو کرتا ہے۔ سب مل کر موتی پرکاش کے گھر، کلا پرکاش کا پکایا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ تنویر موتی پرکاش کو منع کرتے ہیں کہ وہ انہیں وداع کرنے ایئرپورٹ نہ چلیں۔ موتی اُن کی گزارش مانتے ہیں، اور وہ وہیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر وداع ہوتے ہیں۔ تنویر لکھتے ہیں

کہ جڑا ہوا چاند، پھر سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ جدائی کے وقت ایسا محسوس ہوا کہ ہم پھر بھی ملیں گے۔

تنویر کا یہ سفرنامہ، اُن کے دیگر سفرناموں "گھوم کے دیکھی دنیا" اور "آگے جانا ہے مجھے" کی طرح دلچسپ، معلوماتی اور اثر انگیز ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اُسے الفاظ کا روپ دیا۔ وہ ایک حقیقت نگار مسافر، سچائی سے اپنی کتھا بیان کرتے ہیں۔ ٹورسٹ گائیڈ پڑھ کر، بڑے بڑے ہوٹلوں اور ان کے کھانوں کا ذکر کر کے وہ قاری پر اپنا رعب نہیں جھاڑتے۔ اُن کے سفرناموں میں ایسا مرچ مصالحہ نہیں ہوتا، سادگی اور سچائی ہی ان کی خوبی ہے۔

"سفرنامہ کیا ہے؟ کیسے لکھا جائے؟ وہ تنویر عباسی کا سفرنامہ پڑھ کر معلوم ہوا۔ میں نہیں سمجھتا کہ سندھی میں اس سے اچھا سفرنامہ، آج تک کسی نے لکھا ہے۔ تنویر ایک شاعر ہے اور شاعری نے اس سفرنامے میں اُسے پورا پورا فائدہ پہنچایا ہے۔ اس سفرنامے کی زبان (خاص طور پر کیپری جزیرہ کا ذکر) نثر میں شاعری ہے، ایک ایک تصویر، ایک ایک پورٹریٹ اور ایک ایک مجسمے کا ذکر جس خوب صورت انداز میں نہایت واضح گہرائی سے کیا ہے اُسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ تنویر نہایت گہرے مشاہدے کے عادی تھے، ہر بات اور ہر چیز کو باریکی سے دیکھتے تھے۔ چناں چہ تنویر کے سفرنامے میں اس بات کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے کہ وہ قاری کو کسی محلے، گلی، گھر یا مجسمے کے بارے میں صرف بتاتے نہیں بلکہ اُن کی بابت مکمل تاریخی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔"

طارق اشرف

(کتاب. گھوم کے دیکھی دنیا. 1984،ص۔8)

افسانہ نویسی کا تجربہ

تنویر عباسی نے ادبی سفر کے ابتدائی دور میں کچھ افسانے بھی تحریر کیے۔ سندھی میں افسانے کے بجائے ''مختصر کہانی'' کے لفظ استعمال ہوتے ہیں جو کہ انگریزی اصطلاح شارٹ سٹوری کا ترجمہ ہے۔ ابتدائی دور میں لفظ افسانہ ہی استعمال ہوتا تھا۔ سندھی افسانے کے بارے میں تنویر عباسی لکھتے ہیں:

> ''سندھی افسانہ'' بہت وسیع موضوع ہے۔ زیادہ تر جدید افسانے ترقی پسند تحریک کے بعد ہی لکھے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد افسانہ نگاری نے بہت ترقی کی ہے اور متعدد افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس عرصہ میں افسانہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔''

(مھران. تنویر عباسی نمبر. ص. 33)

تنویر عباسی کے لکھے گئے افسانوں میں ونڈ کاء ایمان پاء (کھاؤ کھلاؤ ایمان پاؤ) اور ونی (شال) شامل ہیں۔ تنویر نے یہ افسانے تجرباتی طور پر لکھے تھے، جو موضوع یا معیار کے اعتبار سے درمیانی سطح کے افسانے ہیں۔ لوئی (شال) افسانہ، دیگر افسانوں سے کچھ بہتر ہے۔ موضوع کے حوالے سے جیسا کہ ناقدین نے لکھا ہے کہ زندگی کا کوئی ایک حصہ، کوئی شخص، کوئی واقعہ، کوئی تجربہ افسانے کا موضوع بنتا ہے، تنویر نے لوئی (شال) افسانے میں ایک شخص کو موضوع بنایا ہے۔ رفیق نامی ایک شخص جو بچپن میں ان کا کلاس فیلو رہا ہے۔ وہ کلاس میں ٹیچر کو سننے کے بجائے کارٹون بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ ایک مرتبہ بورڈ پر ہیڈ ماسٹر کا کارٹون بنانے کی پاداش میں اُسے سکول سے خارج کیا جاتا ہے۔ وہی رفیق بڑا ہو کر ایک آرٹسٹ بن جاتا ہے، لیکن عام لوگوں کی خواہش کے مطابق تصاویر بنانے کے بجائے وہ تخلیقی اور وطن کے خوبصورت مناظر کی پینٹنگس بناتا ہے، جس کی وجہ سے تنگدستی اور فاقہ کشی کا شکار رہتا ہے۔ بھوک اور تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہی آرٹسٹ سطحی قسم کی، عامیانہ تصاویر بنانے لگتا ہے اور خوب دولت کماتا ہے اور زندگی عیش و عشرت سے بسر کرتا ہے۔

اس افسانے میں تنویر عباسی نے سماج کی دوہری اقدار پر طنز کیا ہے، جہاں سچے آرٹسٹ کی قدر نہیں

ہے۔ تجرباتی طور پر لکھنے کے باوجود تنویر نے افسانے میں کامیاب کردار نگاری کی ہے اور آخر تک وحدت کا تاثر بھی برقرار رکھا ہے۔ تنویر کے افسانے، اُن کی پہچان تو نہیں ہیں لیکن یہ ابتدائی دور کا ایک اہم تجربہ تھا، جس میں تنویر کسی حد تک کامیاب رہا۔ ''کھاؤ کھلاؤ ایمان پاؤ'' افسانہ بھی ہمارے معاشرے میں موجود منفی رویوں کی عکاسی کرتا ہے کہ جس میں لوٹ کھسوٹ، چور بازاری کے ساتھ رشوت خوری بھی سماجی قدر بن گئی ہے اور ان سے وابستہ افراد اپنے عمل میں کوئی ندامت محسوس نہیں کرتے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک رشوت خور کلرک ہے، جو ابتدا میں اس عمل کو جرم سمجھتا ہے، لیکن بعد میں زمانے کے حالات کو بدلتا دیکھ کر اور لوگوں کی خوش حالی سے متاثر ہو کر، اس راستے پر چلتا ہے اور سکھی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ وہ اپنی اس کمائی میں دفتر کے کسی فرد کو شریکِ حصہ نہیں کرتا اور آخر اُن ہی کی سازش سے رشوت خوری کے الزام میں پکڑا جاتا ہے۔ پکڑے جانے کے بعد وہ پچھتانے لگتا ہے کہ کاش وہ اپنی اس کمائی میں سے دوسروں کو بھی کھلاتا تو اس کا ایمان بچ سکتا تھا یعنی وہ اس گرفت میں نہیں آتا۔

اس افسانے کے ذریعے تنویر نے سوسائٹی میں مروج اُن جھوٹی اقدار پر طنز کی ہے جو ہر آفس میں قائم ہیں جن کی وجہ سے عام آدمی زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اس غیر اخلاقی و غیر قانونی اعمال میں ملوث ہیں وہ ''کھاؤ کھلاؤ'' کے اصول پر چلتے ہیں تو ان کا دھندہ قائم رہتا ہے اور وہ کسی بھی گرفت میں نہیں آتے۔

تنویر عباسی کے یہ افسانے، ان کی ادبی زندگی کی ابتدائی تخلیق ہیں اور انہوں نے خود بھی افسانہ نویس ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ چوں کہ یہ افسانے ان کی تخلیق کا حصہ ہیں اس لیے تنویر کے حوالے سے ان کا تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے۔

خاکہ نگاری

کسی بھی شخصیت کے بارے میں لکھا گیا خاکہ نہ صرف اس شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے، بلکہ ایک دور کی نسبت سے ماضی کے واقعات کو محفوظ کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ تنویر عباسی کی دیگر نثری اصناف کی طرح ان کی خاکہ نگاری بھی منفرد اور دلچسپ ہے۔

انہوں نے جن شخصیات کے پین پورٹریٹ یا اسکیچ لکھے ہیں، اُن سے تنویر کی دوستی، وابستگی اور خلوص نمایاں نظر آتا ہے۔ تنویر نے خاکہ نگاری کے سلسلہ میں اُن شخصیات کا انتخاب کیا ہے، جن کی نجی، گھریلو اور سماجی زندگی سے وہ بخوبی واقف تھے اور انہوں نے اپنے بے تکلف اظہار کے ذریعے یہ کوشش کی ہے کہ قاری کو شخصیت کے بارے میں، تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت آگاہی دے۔ تنویر نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں، اُن میں علامہ آئی آئی قاضی، شیخ عبدالمجید سندھی، حیدر بخش جتوئی، پیر حسام الدین راشدی، مولانا گرامی، مقبول بھٹی، رشید بھٹی، نسیم احمد کھرل، عابدہ پروین، ڈاڈا شاہ، مائٹ لعل، ڈینٹری، عمر باورچی، کینٹین کا منیجر شامل ہیں۔ ان شخصیات پر لکھے گئے خاکے مختلف رسائل و جرائد میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے اور کتابی صورت میں یکجا بھی شائع ہوئے۔ ان کا ایک نامکمل خاکہ مشہور شاعر مخدوم طالب المولیٰ پر بھی تھا۔

علامہ آئی آئی قاضی ایک بے باک اور بااصول عالم تھے۔ جب وہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اس حوالہ سے تنویر عباسی لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک مرتبہ، مشتاق احمد گرمانی جو اس وقت ویسٹ پاکستان کے گورنر تھے، یونیورسٹی آنے والے تھے۔ علامہ قاضی سے کہا گیا کہ گرمانی صاحب سخت مزاج آدمی ہیں اور پھر آپ کے چانسلر بھی ہیں۔ آپ چل کر ان کا اسٹیشن پر استقبال کریں۔ تو علامہ نے فرمایا کہ بے شک مجھے نوکری سے نکال دیا جائے لیکن یہ میرے مزاج کے خلاف ہے کہ میں گورنروں کا استقبال کرتا پھروں۔ بعد میں علامہ نے گورنر کو یونیورسٹی کے دروازہ پر رسیو کیا۔''

شیخ عبدالمجید سندھی کے بارے میں تنویر لکھتے ہیں۔ون یونٹ قائم ہوا تو ہم نوجوان کچھ مایوس ہو گئے کہ اب کیا ہوگا۔سندھ کی صدیوں کی تہذیب،تمدن،زبان سب ختم ہو جائے گا۔لیکن جب شیخ صاحب سے ملے اور ان سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو انہوں نے روایتی انداز میں ہنستے ہوئے کہا: یہ بھی ایک دور ہے۔سندھ پر ایسے کئی دور آئے اور گزر گئے،یہ بھی گزر جائے گا۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی دور برطانیہ میں مجسٹریٹ کی نوکری ٹھکرا کر کل وقتی کارکن بن گئے تھے۔انہوں نے اپنی ساری زندگی کسانوں کے لیے وقف کر دی تھی۔چین کے وزیراعظم چواین لائی جب حیدرآباد آئے تھے تو کامریڈ کو خصوصی پیغام بھجوا کر ان سے بہت اپنائیت سے ملاقات کی تھی۔کامریڈ پر لکھے گئے خاکے میں تنویر نے ان سے اپنی عقیدت اور محبت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔کامریڈ کو جیل میں ہمیشہ سی کلاس میں رکھتے تھے اور انہوں نے کبھی بھی ''بی'' یا ''اے'' کلاس کے لیے کوشش نہیں کی۔

ایوب خان،ون یونٹ مخالفوں کا سخت دشمن تھا۔ان کے دور میں کامریڈ کو سردیوں میں مچھ جیل میں رکھا گیا تھا،جہاں جاڑوں میں سخت سردی ہوتی ہے۔ایوب خان جب لاڑکانہ آئے تھے تو کسی نے اُن سے کہا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کو کسی جرم کے بغیر جیل میں رکھا گیا ہے تو ایوب خان نے کہا تھا کہ:

> ''حیدر بخش جتوئی کا ون یونٹ کی مخالفت میں دماغ گرم ہو گیا ہے،میں نے اس کا دماغ ٹھنڈا کرنے کے لیے اُسے مچھ جیل میں رکھا ہے۔اس کو دو کمبل دیتے ہیں لیکن اب اس سے ایک کمبل واپس لے لیں گے تا کہ اس کا دماغ جلدی ٹھنڈا ہو جائے۔''

پیر حسام الدین راشدی ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔وہ روایتی پیر نہ تھے بلکہ ایک روشن خیال اور وسیع القلب انسان تھے۔پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرز کے گائیڈ تھے۔پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگریاں ملیں لیکن کبھی اپنے نام کے آگے ڈاکٹر نہیں لکھا۔تنویر لکھتے ہیں کہ ممتاز حسن،ڈاکٹر شوکت سبزواری،جمیل الدین عالی،رئیس امروہوی جیسے مشہور عالم و ادیب اکثر پیر صاحب کے ہم جلیس رہے تھے۔ان کے علاوہ بھی اکثر طالبانِ علم بھی ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔کسی کو کوئی حوالہ چاہیے ہوتا،کوئی قلمی نسخے کی تلاش میں ہوتا اور پیر صاحب مہمان نوازی کے سارے فرائض سرانجام دیتے رہتے تھے۔مجھے پہلی ہی ملاقات میں وہ روشن خیال،بے تعصب اور وطن دوست محسوس ہوئے۔وہ ہر معاملے میں مہذب شخص تھے۔اُٹھنا،بیٹھنا،کھانا پینا،لکھنا پڑھنا غرض ہر معاملے میں وہ جتنا شائستگی اور رکھ رکھاؤ کا اہتمام کرتے تھے اور دوسروں سے بھی مہذب ہونے کی اُمید رکھتے تھے۔

مولانا غلام محمد گرامی ایک نامور عالم اور ادیب تھے۔سندھی ادبی بورڈ میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ترقی پسند ادب کی حمایت میں ان کا لکھا گیا طویل مقالا بہ عنوان: ''مشرقی شاعری کے فنی اقدار ور جحانات' ' ایک فکر انگیز تحریر ہے۔گرامی صاحب پر لکھے گئے خاکے میں تنویر لکھتے ہیں:

"1952ء کا زمانہ تھا۔میری عمر تقریباً 17 سال تھی۔مرحوم شیخ عبداللہ نے
میرے کچھ اشعار کی اصلاح کرنے کے بعد مجھے دیتے ہوئے کہا، میں تجھے
ایسے شخص کے ساتھ ملاتا ہوں،کاش کہ میں بھی اُسی سے اصلاح لیتا،آئندہ تم
اپنے اشعار، گرامی صاحب کو دکھایا کرو۔"

گرامی صاحب ایک بزرگ ادیب تھے لیکن وہ نوجوانوں کے ساتھ گھل مل جاتے تھے،اُن سے ہنسی مذاق کرتے اور کبھی اپنی بزرگی و برتری کا اُن پر رعب نہیں بٹھاتے تھے۔وہ بہت خوش مزاج انسان تھے۔

مقبول بھٹی پر لکھا ہوا تنویر کا خاکہ بھی دلچسپ ہے۔وہ شاعر موسیٰ راز کے بیٹے اور سندھی ادبی سنگت کے اہم اور سرگرم کارکن تھے اور شاعری میں دانش تخلص استعمال کرتے تھے۔اسی خاکے میں تنویر نے مقبول بھٹی کے حوالے سے کچھ واقعات بھی لکھے ہیں۔ایک مرتبہ مقبول نے تنویر کو بجلی کا کرنٹ لگنے سے بچایا تھا۔تنویر لکھتے ہیں کہ اگر مقبول کوشش نہ کرتے تو وہ شاید زندہ نہ بچتے۔مقبول بھٹی نے سندھی کتابوں کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ایک بک اسٹال "سندھی کتاب گھر" کے نام سے حیدرآباد میں قائم کیا۔وہ نہ صرف کتاب گھر بلکہ ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بھی تھا۔ڈاکٹر خلیل، محمد عثمان ڈیپلائی، مظفر حسین جوش، منظور نقوی، سرور علی سرور، غلام محمد گرامی، عبداللہ خواب، عبدالقیوم صائب، شمشیر الحیدری، نیاز ہمایونی، مصطفیٰ قریشی و دیگر ادیب وکلا اکثر آتے رہتے تھے، کتاب بھی مل جاتے اور ادیبوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔مقبول کے تحقیقی کام کے حوالے سے تنویر لکھتے ہیں کہ:

"مقبول بھٹی نے کافی کے بادشاہ مصری شاہ پر جو کام کیا ہے وہ ایک یادگار کام
ہے اور آج تک مصری شاہ پر اس سے بہتر کام نہیں ہوا ہے۔مقبول نے جس
طرح مصری شاہ کے کلام اور اُس کی سوانح حیات کو حاصل کرنے کے لیے
کاوشیں کی ہیں، اُس کو ادبی تاریخ نویس اور نقاد کبھی بھول نہ سکیں گے۔"

رشید بھٹی،تنویر کے بہت ہی قریبی ساتھی تھے۔1955 میں ربانی،تنویر، حفیظ اور رشید کی دوستی،ادبی دنیا میں ایک مثالی دوستی تھی۔حفیظ کا انتقال ہوگیا، ربانی اسلام آباد اور حیدرآباد میں رہے لیکن تنویر اور رشید کا تعلق رشید کی وفات (1988ء) تک قائم رہا۔رشید بھٹی ایک کمیٹڈ ادیب تھے۔سندھی ادب اور زبان کے لیے انہوں نے قید و بند کی تکالیف بھی برداشت کیں۔وفات سے ایک ہفتہ قبل تنویر عباسی امر جلیل کے ساتھ رشید بھٹی کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے تو اُن کو وہ وہاں بھی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے میں مصروف دکھائی دیے۔تنویر اکثر اُن سے ملنے سکھر جاتے تھے۔تنویر لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں رشید بھٹی سندھی ادیب کے لیے ایک ماڈل ہونا چاہیے، کہ کیسے
انہوں نے اپنے ضمیر کو قائم رکھتے ہوئے، مرتے دم تک اپنی زبان و عوام کے لیے کچھ
نہ کچھ کرتے رہے۔سیاسی کارکن کی حیثیت سے بھی وہ ایک بہادر انسان تھے۔"

نسیم احمد کھرل نامور افسانہ نگار تھے اور تنویر عباسی کے شہر خیر پور سے ہی ان کا تعلق تھا۔ بقول تنویر، شکل وصورت اور عادات واطوار سے وہ وڈیرا لگتے تھے۔ کوئی اُسے دیکھے، تو گمان نہیں ہوتا کہ یہ افسانہ نگار بھی ہو سکتے ہیں۔ نسیم کھرل پر لکھا گیا خاکہ مختصر، مگر بھرپور ہے اور تنویر نے ان کا مکمل چین اسکیچ بنایا ہے۔ نسیم کے افسانے جب شائع ہوئے تو ادبی حلقوں نے، نام کی وجہ سے اُسے کوئی خاتون سمجھا تھا۔ تنویر کے ذہن میں بھی ملاقات سے پہلے یہی تصور تھا۔ تنویر لکھتے ہیں کہ:

"کراچی میں پیر حسام الدین راشدی کے ہاں بیٹھا تھا کہ انہوں نے نسیم کھرل کے کسی افسانے کی تعریف کی تو میں نے سوچا، پیر صاحب تو تاریخ نویس ہیں، انہیں افسانے کی کیا خبر، لیکن جب سندھی ادبی سنگت خیر پور کی ایک تنقیدی نشست میں، نسیم کھرل نے اپنا افسانہ "کافر" پڑھا تو میں حسام الدین راشدی کی افسانہ شناسی اور نسیم کھرل کی افسانہ نویسی، دونوں کا قائل ہو گیا۔"

نامور گلوکارہ عابدہ پروین سے تنویر عباسی کے مراسم رہے۔ جب وہ فن کی دنیا میں نئی نئی آئی تھیں تو تنویر نے اُن کی بہت ہمت افزائی کی تھی۔ سندھی گریجویٹس ایسوسی ایشن نے جب 1983ء میں عابدہ پروین کے ساتھ ایک شام رکھی تھی تو تنویر عباسی نے اُن کے فن کے بارے میں وہاں انگریزی زبان میں ایک مضمون پیش کیا تھا۔ عابدہ پروین پر لکھا گیا تنویر کا خاکہ سندھی موسیقی کی روایات سے لے کر عابدہ کی شخصیت وفن تک ایک دلچسپ معلوماتی تحریر ہے اور قاری کو علم ہوتا ہے کہ عابدہ زندگی کے کن مراحل سے گزر کر فن کے اس مقام تک پہنچی ہیں۔ تنویر عباسی، عابدہ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کلام کا انتخاب بھی بہتر کرتی ہیں۔ اس کی نظر میں کلام معنی خیز اور گہرا ہونا چاہیے۔ ہلکا اور بازاری نہ ہو۔ گاتے وقت وہ الفاظ میں جان پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ منفرد فنکارہ ہیں، جس نے شاہ لطیفؒ، سچل سرمست، بلھے شاہ، خواجہ فرید، نبی بخش قاسم، خیر محمد ہیسبانی، شاہ نصیر، میر سانگی، بیڈھل فقیر اور دیگر کلاسیکی شعراء کے کلام کو گایا ہے۔"

دادا شاہ خیر پور کی ایک جانی پہچانی اور انوکھی شخصیت تھی، ان کے بارے میں تنویر عباسی نے نہایت محبت سے لکھا ہے اور کردار نگاری کچھ اس انداز سے کی ہے کہ جیسے دادا شاہ ہمارے روبرو موجود ہیں۔ دادا شاہ کی خیر پور میں اپنی سینما تھی۔ ایک دفعہ اُسے "مومل رانو" (تاریخی کہانی) پر فلم بنانے کا شوق ہوا۔ دادا شاہ کی فرمائش پر تنویر عباسی نے فلم کی کہانی اور گانے لکھے۔ فلم کے دیگر فنکاروں کے ساتھ نور جہاں اور مہدی حسن کی آواز میں بھی ریکارڈ کیے گئے جو بہت مقبول ہوئے اور آج تک ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ تنویر عباسی لکھتے ہیں کہ:

"دادا شاہ کو فلم کی کہانی، ڈائیلاگ اور گیت زبانی یاد ہو گئے تھے۔"

فلم کے لیے کئی ڈائریکٹرز آئے، فلم کی کہانی پڑھ کر کچھ ہدایات دے کر ایڈوانس لے کر غائب ہو جاتے تھے اور پھر دادا شاہ کسی دوسرے ڈائریکٹر کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح تین فلموں جتنے اخراجات ہو گئے، پھر بھی فلم موئل راتو (موسل راٹون) مکمل نہ ہو سکی اور دادا شاہ کی وفات کے بعد یہ باب ہی ختم ہو گیا۔

لعل جونیجو، لیاقت میڈیکل کالج کی سانولی نرس ڈیٹری، عمر باورچی، مست فقیر الن شاہ، سورج ورنی اور کینٹین کا منیجر یہ سب ایسے کردار ہیں، جن کی کچھ خوبیوں سے متاثر ہو کر تنویر نے ان پر خاکے تحریر کیے۔ ان خاکوں میں میڈیکل کالج کے دنوں کی یادیں اور شرارتیں محفوظ ہیں۔ کینٹین کے منیجر کے ساتھ مذاق کرتے ہیں کہ وہ اس کی سالگرہ منائیں گے اور سالگرہ کے موقع پر منیجر کا چُرایا ہوا کیک بھی کاٹتے ہیں۔ کینٹین سے اُدھار میں کھانا اور پھر منیجر کو ستانا۔ سورج ورنی کے عشق میں شفیق کی پٹائی کروانا، الن شاہ مست کے ساتھ مذاق کرنا۔ اُسے مدہوش کر کے، اُس کے پیسے چُرانا۔ الن شاہ مست کے خاکے میں تنویر لکھتے ہیں:

> ''ہم سب اپنی ساری زندگی، الن شاہ کے صرف ایک دن کی طرح گزارتے ہیں۔ خالی ہاتھ روتے ہوئے آتے ہیں اور مرتے دم تک مال اکٹھا کرتے ہیں اور جب زندگی کی شام ہوتی ہے تو سب کچھ چھن جاتا ہے۔ جب زندگی ہم سے مذاق کرتی ہے تو ہم میں الن شاہ جیسا بھی حوصلہ نہیں ہوتا کہ ہم زندگی کی ستم ظریفی پر ہنس سکیں۔''

عمر باورچی ایک معمولی کردار ہے، لیکن وہ کئی خوبیوں کا مالک ہے۔ سنگیت اور سُر تال کے بارے میں جانتا ہے۔ تنویر لکھتے ہیں کہ:

> ''مجھے سُروں سے شناسائی میوزک ڈائریکٹر غلام نبی اور عمر باورچی نے کروائی۔ عمر نے ''راتو'' اور ''سورٹھ'' کے ایسے الاپ سنائے کہ جب میں نے وہ الاپ عابدہ پروین کو 1979ء میں سنائے تو اُسے بھی پسند آئے اور وہ ابھی تک وہی الاپ کرتی آرہی ہے۔''

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی شخصیت کے بارے میں لکھے گئے غیر مطبوعہ خاکے میں تنویر عباسی نے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اُنہیں ایک بہت بڑا روشن خیال عالم اور مذہبی رہنما مانا ہے۔ قاسمی صاحب کے بارے میں تنویر نے کئی باتیں لکھی ہیں اور کچھ واقعات بھی بیان کیے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کتنے بڑے آدمی تھے۔ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تنویر عباسی اس خاکے میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی اور ڈاکٹر غلام علی الانا، خیرپور میرے پاس الطاف عباسی کی تعزیت کے لیے آئے تو کہنے لگے کہ سکھر جا کر مولائی شیدائی کی بھی تعزیت کی جائے، جن کا انہی دنوں

انتقال ہوا تھا۔ وہاں سے ہو کر ہم رشید بھٹی کے پاس گئے اور اس نے فتاح ملک کو فون کر کے بلایا۔ فتاح ملک اپنے ساتھ ایک بوتل بھی لائے اور اُسے کھولتے ہوئے بولے "مولانا صاحب معاف کیجیے گا، ہم کچھ گستاخی کریں گے۔"

تو مولانا قاسمی صاحب نے مسکرا کر بڑی فراخ دلی سے فرمایا "بھئی معاف تو آپ مجھے کریں کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دیتا۔"

اس جملے سے مولانا قاسمی کی وسعتِ قلبی اور روشن خیالی عیاں ہوتی ہے۔

مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ پر لکھے گئے نامکمل خاکے کی ابتداء، تنویر ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"شہد کی مٹھاس، مکھن کی نرمی، شبنم کی تازگی اور کلی کی مسکراہٹ ان سب کو ملائیں تو مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ کی شخصیت اُبھر کر سامنے آئے گی۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنویر کتنے فراخ دل انسان تھے۔ اس دور میں سندھی غزل کی جو صورت حال تھی، اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"شاہ لطیفؒ کی وائی کبھی کبھی ریڈیو سے سُننے میں آتی تھی، نہیں تو سندھی غزل ہی نشر ہوتی تھی۔ اکثر وہ غزل قوال گاتے تھے۔ ایک مرتبہ اناؤنسر نے کہا، مخدوم طالب المولیٰ کی غزل صالح محمد قوال اور ساتھیوں سے سُنیے۔"

خاکہ نگاری کے فن میں بھی تنویر ہمیں ایک ایسے منفرد قلم کار نظر آتے ہیں، جسے اپنے فن اور زبان دونوں پر دسترس ہے۔ کسی بھی دور کا قاری، جب ان خاکوں کا مطالعہ کرے گا تو ذکر کردہ شخصیات کی تصوراتی اشکال اپنے سامنے پائے گا۔

بحیثیت مترجم

تنویر عباسی کی بنیادی پہچان تو ایک شاعر کی ہے، لیکن ان کی نثری تحریریں بھی نہایت فکر انگیز اور متاثر کن ہیں۔ وہ ایک جفاکش اور مسلسل لکھنے والے ادیب اور محقق بھی تھے۔ انہوں نے وقت کی قدر کی اور خود کو ادبی کاوشوں اور سرگرمیوں میں مصروف رکھا اور اپنا وقت کبھی بھی ضائع ہونے نہ دیا۔ اُن سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ کسی نہ کسی ادبی کام میں مصروف نظر آئے۔ لکھنا پڑھنا ہی ان کی زندگی کا اہم مقصد و مشن رہا۔ ادب ان کا مقصد بھی تھا اور تسکینِ ذات کا سبب بھی۔ جب کبھی تحقیق سے فرصت ہوئی اور شاعری کچھ دنوں کے لیے ناراض ہوئی تو انہوں نے ترجمہ کی طرف رجوع کیا۔

ایک ویت نامی ناول نے انہیں متاثر کیا تو اس کا ترجمہ "جي مارڻا نه موت" (موت نہ جن کو مار سکی) کے نام سے کر لیا۔ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر سندھی ادب میں انقلابی ادب کا رجحان زیادہ تھا اور تراجم بھی زیادہ مزاحمتی اور احتجاجی ادب میں سے کیے جاتے تھے۔ فلسطین، روس، چلی، ویت نام، چین اور دیگر ممالک کے انقلابی ادب کا انتخاب سندھی میں ترجمہ ہو رہا تھا۔ تنویر عباسی نے اس ناول کا ترجمہ نہایت سادہ مگر پر اثر زبان میں کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار نگوین وان تروئی ہے۔ وہ اپنی دھرتی سے محبت کرنے والا ایک سچا وطن دوست کامریڈ ہے، جو مرتے وقت بھی اپنی دھرتی کو دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

ویت نام کی جنگ کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناول کی کہانی بھی دیگر انقلابی نوجوانوں کی طرح ہے جو اپنی دھرتی کے دفاع کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور غاصبوں کے عزائم خاک میں ملا دیتے ہیں۔ نگوین وان تروئی، جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ایک نوجوان، جو ویت نام پر امریکی حملے کے بعد دشمنوں کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں وہ امریکی وزیرِ دفاع کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے، جس میں وہ ناکام ہو کر پکڑا جاتا ہے۔ اس کی بیوی کو بھی گرفتار کیا جاتا ہے۔ دونوں کو ٹارچر کیمپ میں اذیتیں دی جاتی ہیں لیکن وہ دونوں دشمن کے آگے جھکتے نہیں ہیں۔

نگوین وان تروئی کی آزادی کے لیے ویت نام میں احتجاجی مظاہرے ہوتے ہیں لیکن امریکی فوجی وان تروئی کو کسی اعلان کے بغیر گولی سے اُڑا دیتے ہیں اور اُسے اپنی بیوی سے آخری ملاقات کا موقع بھی فراہم نہیں کرتے۔ سندھی ادبی حلقوں میں یہ ناول بے حد مقبول ہوا، جس کے پانچ سے زائد ایڈیشن

شائع ہوئے ہیں۔

تنویر عباسی سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں پر بہت عمدہ عبور رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ان کی دلچسپی تھی، خصوصی طور پر وہ فرنچ ادب سے بے حد متاثر تھے۔ اسی جذبہ کے تحت خیر پور میں، کیس ڈی گروٹ سے انہوں نے فرنچ سیکھی اور فرنچ شاعری کے کچھ تراجم سندھی زبان میں کیے۔ فرنچ شعراء رابرٹ ڈیسنو، پال جیرالدی، چارلس بودلیئر، پال ورلین، ایم ایم ڈیوی اور جولیس سپروائیل کو انہوں نے سندھی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ چینی لوک گیت، سیفو (یونانی)، ٹی ایس ایلیٹ (امریکی)، رلکے (جرمن) اور والٹ وٹمن (امریکی) کی منتخب شاعری کو سندھی میں متعارف کرایا۔ تنویر عباسی کے کیے ہوئے شعری تراجم ان کے مجموعۂ کلام ''شعر'' اور ''یہ دھرتی'' میں شامل ہیں۔

تنویر عباسی فطرت سے محبت کرنے والا ایک حسن پرست شاعر تھا اور ہمیشہ نیکی اور حسن کا متلاشی رہا۔ غیر ملکی شاعری کا انتخاب بھی انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق کیا اور اُسے سندھی شاعری میں اس طرح منتقل کیا کہ اُس کا فکر متاثر نہ ہو۔ تنویر عباسی کی ترجمہ شدہ شاعری سے کچھ انتخاب یہاں پیش کرتے ہیں۔

سیفو (یونانی شاعری)

چاہے میرے اشعار
ہوا میں گم ہونے والا اک راز
پھر بھی جو میں کہوں
وہ ہے ایک امر آواز

☆

شام کا تارا
آسمان کے سینے پر
سب تاروں سے زیادہ
حسین ہے

☆

اپنے زہر سے
جسے نہ روکا جائے
جو کڑوا ہے
جو میٹھا ہے
پیار جب بھی چاہے مجھ کو

ناتواں کر کے
مارے مجھ کو
اپنے زہر سے
کسی کوبرا سانپ کی طرح

(سندھی سے ترجمہ ۔ ا ۔ س ۔ شعر ۔ ص 124)

رائنر میریا رلکے (جرمن شاعری)

اس دنیا میں

اس دنیا میں
جہاں کہیں بھی کوئی روتا ہے
بلاوجہ کوئی روتا ہے
میرے لیے ہی روتا ہے
اس دنیا میں
جہاں کہیں بھی کوئی ہنستا ہے
بلاوجہ کوئی ہنستا ہے
میرے لیے ہی ہنستا ہے
اس دنیا میں
گر کوئی بھی، کسی طرف کو جاتا ہے
بلاوجہ ہی جاتا ہے
میری طرف ہی آتا ہے
اس دنیا میں
جہاں کہیں بھی، کوئی مرتا ہے
بلاوجہ گر مرتا ہے
میری طرف ہی دیکھتا ہے

(سندھی سے ترجمہ ۔ ا ۔ س ۔ شعر ۔ ص (131)

بارش

گاؤں پر جیسے بارش ہو
میرے دل پر برس رہی ہو
وہ کون سی پریشانی ہے
جو میرے دل میں بیٹھ گئی ہے
دھرتی اور گھروں کی چھتوں پر
برسنے والی بارش کی
اے میٹھی آواز
ایک دکھی دل کی خاطر
بارش کا ہو کوئی ساز
بے سبب برس رہی ہے بارش
اُس دل پر، جو دکھی ہے
جس کا درد بھی ہے بے سبب
درد بُرا اتنا ہے بہتر
جو بھی ہے بے سبب
محبت اور نفرت کے بغیر
میرے دل میں اتنا درد

(سندھی سے ترجمہ ۔ ا ۔ س ۔ یہ دھرتی ۔ ص86)

آپ کے پیار کی خاطر

میں تنہائی میں ہی اپنا آشیانہ بناؤں گا
پہاڑوں کی اونچائی پر
چٹانوں کی گھاٹیوں میں ہی
میں بوڑھا ہو جاؤں گا
میرے اندر کی آگ
آسمان کی طرف اُڑے گی
جس کی لَو کو
کوئی بھی طوفان
ہلا نہیں سکے گا
ایسا نہ کہنا میرے رفیقو!
کہ میں آپ سے مُکر گیا
ایسا نہ سمجھنا کہ میرا درد
میرے لیے ہے انجان
جب بھی گردن اُٹھاؤ گے
تم دیکھو گے ایک لَو
پہاڑ کی چوٹی پر
تم سوچو گے
کہ وہ تمہارے لیے کس نے جلائی ہے
آخر سمجھ جاؤ گے تم
کہ میں وہاں پر
ٹھہرا ہوا ہوں
آپ کے پیار کی خاطر

(سندھی سے ترجمہ۔ ا۔ س۔ بہ دھرتی۔ ص83)

گفتگو

فطرت ایک مندر ہے
جس کے زندہ
کبھی کبھی کوئی مبہم سی زبان بولتے ہیں
علامتوں کے جنگل میں سے
کوئی آدمی جب گزرتا ہے
تو یہ اُس کو پہچانتی ہوئی نگاہوں سے
گھورتے ہیں
کچھ خوشبوئیں
بچوں کے جسموں کی طرح ٹھنڈی
اور شہد جیسی میٹھی ہیں
اور کھیتوں جیسی ہری
اور دوسری بگڑی ہوئی
بلند اور فتح مند

(سندھی سے ترجمہ۔ ا۔س،یہ دھرتی۔ ص94)

شاعری کے ان تراجم میں تنویر عباسی نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ ایسا ہو کہ اس میں شاعری کی اصل فکر برقرار رہے۔ انہوں نے ورڈسورتھ کے ''سُر یلے گیت''(Lyrica Balads) کے پیش لفظ کا ترجمہ بھی سندھی میں کیا تھا جو کہ سندھی بورڈ کے تحقیقی جریدے ''سھراڻ ''(مہران) میں شائع ہوا تھا۔

بطور نقاد اور تبصرہ نگار

تنویر عباسی بنیادی طور پر شاعر ہی تھے لیکن وہ متنوع صلاحیتوں کے مالک تھے اور بیک وقت ادبی تنقید، تحقیق، شخصیت نگاری اور دوسری نثری اصناف میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ناقدانہ صلاحیتیں ان کی ذات کا حصہ تھیں۔ ان کے لکھے ہوئے تبصرے کسی تنقیدی مضمون سے کم نہیں ہیں۔ سادگی اور بے ساختگی تنویر کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت ہمیں ان کے تبصروں میں بھی نظر آتی ہے۔ تنویر کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ اپنی تحریروں میں ہر بات دلائل کی روشنی میں کیا کرتے تھے۔ ان کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ جس میں سے مندرجہ ذیل مضامین خاص طور پر بہت مقبول ہوئے ہیں۔

1۔ سندھی زبان کا مسئلہ
2۔ دھرتی کی خوشبو
3۔ سندھی زبان کا رسم الخط
4۔ میلے اور ادبی کانفرنسیں
5۔ زبان اور وطن
6۔ سندھی زبان کا ہل
7۔ پاکستانی کلچر
8۔ خاص سکول اور سندھی بچے
9۔ ون یونٹ مخالف تحریک اور سندھی ادب
10۔ سندھی زبان کی للکار
11۔ بچل سرمست
12۔ سندھی ادیبوں کے مسائل
13۔ قاضی قادن کا کلام (تبصرہ)

14۔ سندھی لوک ادب

15۔ ادب اور افادیت

16۔ اسلامی اور غیر اسلامی نام

17۔ جاپانی ہائیکو

18۔ آزاد نظم

19۔ جدید سندھی شاعری

20۔ ادب اور سائنس

21۔ عابدہ پروین (انگریزی میں)

22۔ شاہ لطیفؒ کی شاعری (انگریزی میں)

23۔ سندھی شاعری صدیوں سے (انگریزی میں)

ان سارے مضامین میں تنویر کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کے ساتھ قاری ان کے مطالعے کی گہرائی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ آزاد نظم اور ہائیکو پر لکھے گئے مضامین میں، جدید انگریزی اور فرنچ ادب سے کئی حوالا جات دیے گئے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ، بودلیئر، شیلی، ازرا پاؤنڈ، والٹ وٹمن اور دیگر ناقدین کی آرا کی روشنی میں انہوں نے آزاد نظم کے وصف اور فنی تکنیک کو عالمانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اسی طرح جاپانی ہائیکو کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے، انہوں نے باشو، بوسن، ایسا اور دیگر کلاسیکی جاپانی شعراء سے لے کر جدید شعراء کے ہائیکو کی مثالیں لکھی ہیں۔ ہائیکو کے بارے میں مزید مطالعے میں انہوں نے ہائیکو کے بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس طرح ہائیکو کے عناصر، ہائیکو روم، ہائیکو میں تجنیسِ حرفی وغیرہ کی وضاحت کرتے ہوئے، ہائیکو کے نامور شعراء کے ہائیکوز کا انتخاب بھی مضمون میں شامل کیا ہے۔ ''جدید سندھی شاعری'' کے موضوع پر لکھا گیا تنویر کا تحقیقی مضمون 1960ء میں لکھا گیا تھا لیکن پھر بھی موضوع پر تنویر کی علمی وسعت اس سے عیاں ہوتی ہے۔ ''ادب اور سائنس'' ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت لکھا جا چکا ہے، لیکن تنویر نے اپنے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر بھی انفرادی انداز میں لکھا ہے۔ شاعری کی اہمیت اور افادیت بیان کرتے ہوئے انہوں نے ورڈز ورتھ کا یہ حوالہ دیا ہے کہ:

> ''سائنس دان سچائی کی تلاش کرتا ہے، لیکن سچائی اس کے لیے ایک غیر مانوس اور دور کی چیز ہے، جس کی وہ تنہائی میں پرستش کرتا ہے۔ لیکن شاعر ایک ایسا گیت گاتا ہے، جس میں سارے انسان اُس کے ساتھ ہیں۔ وہ سچ کے وجود سے ایک مسرت حاصل کرتا ہے اور سچ کو اپنا زندہ جاوید دوست سمجھتا ہے۔ شاعری سارے علوم کی سانس اور لطیف روح ہے۔''

تنویر نے یہ مضمون 1958ء میں تحریر کیا تھا، لیکن ہم آج بھی جب اس مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی نام کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں تنویر نے بحث کی ہے کہ ناموں کا تعلق مذہب کے بجائے ثقافت سے زیادہ قریب ہوتا ہے، انہوں نے کئی مثالیں دی ہیں کہ قبلِ اسلام جو نام تھے وہ ان شخصیات نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی جوں کے توں رکھے اور تبدیل نہیں کیے۔

تنویر عباسی نے اپنے جملہ مضامین میں، چاہے وہ ابتدائی دور کے ہوں یا بعد کے، ایک ریسرچ اسکالر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ مضامین اپنے عنوانات کے دائرے سے کہیں بھی باہر تجاوز کرتے دکھائی نہیں دیتے اور نہ ان کا اختصار ان کی مقصدیت اور تاثر پذیری پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تنویر عباسی نے پیر حسام الدین راشدی کی کتاب (هو ذوتي هو ڏينهن) "وہ ساتھی وہ دن" اور ہیرو ٹھکر کی تحقیق (قاضي قادن) "قاضی قادن کا کلام" پر جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے بہترین مضامین ہیں جن سے تنویر کا تنقیدی شعور اور بھی نمایاں ہوتا ہے۔ راشدی صاحب کی کتاب کے بارے میں، اپنے مضمون میں تنویر عباسی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "پیر صاحب نے یہ کتاب ملیا میں لکھی، جہاں وہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے اپنی ذاتی کیفیات کا ہی ذکر کیا ہوگا۔ ویسے بھی کہتے ہیں موت کو سامنے دیکھنے والے کا بیان صحیح ہوتا ہے۔ یہ بھی پیر صاحب کی (Dying Declearation) ہے، جس کے ہر جملے میں ایمان داری اور ہر لفظ میں حقیقت ہے، چاہے وہ راشدی صاحب کی ذاتی کیفیات کا نتیجہ کیوں نہ ہو۔"

قاضی قادن سولہویں صدی عیسوی کے ایک نامور سندھی شاعر تھے، جن کے پہلے صرف سات ابیات ملے تھے۔ بعد میں بھارت کے نامور محقق وادیب ہیرو ٹھکر نے اپنی جستجو سے، ہریانہ صوبے کے راٹیلا گاؤں کے ایک مندر سے، کبیر، سورداس، دادودیال اور دیگر شعراء کے ساتھ قاضی قادن کا کلام بھی ایک پستک سے حاصل کیا، جو کہ دیوناگری رسم الخط میں تھا۔ بعد میں جب یہ کلام موجودہ سندھی رسم الخط میں شائع ہوا تو تنویر عباسی نے اس پر بھرپور تنقیدی تبصرہ کیا اور ہیرو ٹھکر کی اس تحقیق کی تعریف بھی کی اور اُسے سندھی ادب کے لیے نیک فال قرار دیا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "سندھی قدیم ادب پر تحقیق اور کھوج کرنے کے لیے ہمارے علماء و محققین کو دیوناگری رسم الخط سیکھنا چاہیے اور اس رسم الخط میں لکھی گئی پُرانی کتب کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ ہندوؤں کے مقدس مقامات پر مسلمان شعراء کا کلام، اُن کی مذہبی اور ادبی شخصیات کے ساتھ رکھا گیا ہے، یہ اس دور کے بے

تعصب سماج کی خوبی ہے کہ جہاں سورداس، میراں بائی اور گرونانک ہیں وہاں
شیخ فرید، شاہ حسین اور قاضی قادن بھی ہیں۔"

تنویر عباسی کے کیے گیے ان تنقیدی تبصروں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان میں ایک نقاد کی جملہ خصوصیات موجود تھیں اور ان کے تبصرے، روایتی انداز سے ہٹ کر علمی اور مدلل ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور ان کی قوتِ تخیل، تنقیدی اظہار میں مواد کی گہرائی تک پہنچنے میں ضرور ان کی معاون ثابت ہوئی ہوگی۔

پیش لفظ و دیباچے

کسی کتاب کا پیش لفظ (Preface) یا مہاگ لکھنا فکری حوالہ سے ایک نہایت محنت طلب کام ہوتا ہے۔ کسی تحریر کا بغور مطالعہ کرنا، پھر اس کے بارے میں تفصیل اور باریک بینی سے اپنی رائے دینا کہ قاری پوری کتاب کا مقصد و مفہوم سمجھ جائے، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تنویر عباسی وسیع مطالعہ رکھنے والے ایک ایسے مہربان دانشور تھے، جنہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ، نہ صرف اپنے ہم عصروں کی تخلیقات کے دیباچے لکھے بلکہ نئی نسل کے نوجوانوں کی کتابوں کے پیش لفظ لکھ کر ان کی عزت و شہرت میں اضافہ کیا۔ تنویر عباسی نے اپنے جن ہم عصر اور نوجوان ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی کتابوں پر مقدمے لکھے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1۔ ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو (سچل لغات۔ تحقیق)

2۔ رشید بھٹی (ویس سویا دل والے جاگے۔ افسانے)

3۔ ڈاکٹر نواز علی شوق (سچل سرمست کا طالب فقیر صلاح۔ تحقیق)

4۔ تاج بلوچ (خوشبو کا زہر۔ شاعری۔ 1985ء)

5۔ بردہ سندھی (آنکھیں میگھ ملہار۔ شاعری)

6۔ یوسف شاہین (اندر میں ہوئی روشنی۔ شاعری)

7۔ امداد حسینی (امداد ہے آوارہ۔ شاعری)

8۔ حمید سندھی (کاش پریتم آؤ۔ تحقیق)

9۔ میر محمد پیرزادہ (شبنم سے بھیگی کلیاں۔ شاعری)

10۔ نارائن شیام (بوند لہریں اور سمندر۔ شاعری)

11۔ فتاح ملک (کنول جڑیں پاتال میں۔ شاعری)

12۔ ڈاکٹر نواز علی شوق (سندھ کا عطار۔ تحقیق)

13۔ تاجل بیوس (جب بنی دھرتی۔ شاعری)

14۔ فقیر علی محمد تالپور (رتن انمول۔ شاعری)

15۔ سندری اُتم چندانی (پریت پُرانی ریت نرالی۔ ناول)

16۔ محمد علی حداد (سچل سرمست کی ببلوگرافی۔ تحقیق)

17۔ نظام زائر (جُھر جُھر تیری خوشبو۔ شاعری)

18۔ عبدالغفور عابد (میرے اشعار یہ سادہ۔ شاعری)

19۔ علی مرتضیٰ دھاریجو (جنس کی سائنسی معلومات۔ تحقیق)

20۔ نظام بھٹی (ایٹم سے ایٹم بم تک۔ سائنس)

21۔ ایاز گل اور تاج جویو (خیال مہکتے پھول۔ شاعری)

22۔ ذوالفقار سیال (لال ہاتھ پیلے چہرے۔ شاعری)

23۔ مختیار ملک (اندھیرے میں بھی روشنی۔ شاعری)

24۔ پشپا ولبھ (کھڑکی سے باہر۔ شاعری)

25۔ ایاز گل (درد کا کوئی انت نہیں۔ شاعری)

26۔ نجمہ نور (چاند اور اجرک۔ شاعری)

27۔ اختر درگاہی (مسکرانے لگی شاعری۔ شاعری)

ان دیباچوں میں سب سے زیادہ تفصیل سے لکھے گئے، نارائن شیام (بوند، لہریں اور سمندر۔ شاعری) اور ایاز گل (درد کا کوئی انت نہیں۔ شاعری) کے پیش لفظ ہیں جو تنویر نے نہایت محنت اور محبت سے لکھے ہیں۔ اختر درگاہی کے شعری مجموعے ''مسکرانے لگی شاعری'' کا پیش لفظ، تنویر عباسی کا آخری پیش لفظ تھا، جو انہوں نے انتقال سے بیس دن قبل 6 نومبر 1997 کو لکھا تھا۔ تنویر عباسی کے لکھے گئے پیش لفظ اور دیباچوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر پیش لفظ دل سے لکھا ہے۔ ہاں البتہ کچھ کتب پر مختصراً اور کچھ پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ان تحریروں میں بھی تنویر کا اندازِ بیان ایک دانشور، عالم جیسا ہے اور وہ اپنی آرا، دلائل کی روشنی میں دیتے ہیں۔ نئی نسل کے مشہور شاعر ایاز گل کے مجموعہ کلیات ''درد کا کوئی انت نہیں'' کا پیش لفظ انہوں نے بھرپور انداز میں لکھا ہے اور ان کی شاعری کے کئی پہلوؤں کو انہوں نے ترتیب وار اُجاگر کیا ہے۔ اسی طرح نارائن شیام، جسے تنویر بہت پسند کرتے تھے، ان کے مجموعۂ کلام ''بوند، لہریں اور سمندر'' کا پیش لفظ بھی انہوں نے بڑی محبت اور لگن سے لکھا ہے اور دل کھول کر اپنے محبوب شاعر کی شعری و فنی خوبیوں پر اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ تنویر عباسی کے لکھے گئے اس پیش لفظ کے بارے میں خود شاعر نارائن شیام اور کلا پرکاش نے یوں لکھا ہے:

''22 تاریخ کو بھائی موتی پرکاش، دلی آئے تھے اور مہربانی فرما کر مجھ سے ملنے

کے لیے میرے گھر بھی آئے تھے۔''بوند، لہریں اور سمندر'' کی چار کاپیاں بھی
دے کر گئے۔ یہ سندھ کی سوکھڑی (تحفہ) محبت کا جواب پا کر بہت خوشی محسوس
ہوئی۔اس مطالعہ میں تم نے جس نزاکت سے شاعر کی تجدید اور تحدید کو ظاہر کیا
ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔''

شیام کو شاعر
کہے گا کوئی پاگل

نارائن شیام - دلی

(تنویر کو لکھے گے خط کا حصہ۔ 28جون1988ء)

'' آپ کا لکھا ہوا پیش لفظ پڑھا، تو وہ دن یاد آنے لگے جب آپ، قمر اور شیام،
یہاں دبئی آئے تھے۔آپ دونوں تو پہلے ہی شاعر شیام کے فین تھے، لیکن اس
خاموش کلاکار (شاعر) نے بطور شخص بھی آپ کو متاثر کیا تھا۔اس کی شاعری
سے آپ نے شیام کا رُوپ نروار کر کے پیش لفظ میں دکھایا ہے کہ اس کی آتما
خالص سندھی ہے۔شیام کی فنی کمالیت، اُمنگیں اور احساسات سب سندھو کے
پانی میں ڈھلے ہوئے ہیں۔''

کلاپرکاش - دبئی

(تنویر کو لکھے گے خط کا حصہ۔ 28جون1988ء)

تقاریر و لیکچرز

تنویر عباسی عملی طور پر بھی ایک متحرک شاعر و ادیب تھے۔ وہ اکثر علمی و ادبی تقاریب میں شریک ہوتے تھے اور انہیں وہاں تقاریر کرنی پڑتی تھیں۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت انہوں نے کئی ادبی مجالس میں لیکچرز بھی دیے۔ ان کی اکثر تقاریر و لیکچرز مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ نوجوان افسانہ نویس ابراہیم کھرل نے ان تقاریر اور لیکچرز کو یکجا کر کے "خواب سے خوبصورت حقیقت" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی، جسے جنرا مداس نے شائع کیا ہے۔ ان لیکچرز اور تقاریر کی تفصیل اس طرح ہے۔

1۔ صوفی، سندھ اور موسیقی (لیکچر)
2۔ شاہ لطیفؒ کی شاعری پر توسیعی لیکچر
3۔ خواب سے خوبصورت حقیقت (تقریر)
4۔ شاہ لطیفؒ کی شاعری میں موسیقیت (تقریر)
5۔ سندھی ادبی سنگت۔ تاریخ اور کردار (تقریر)
6۔ نوجوان۔ سندھ کا روشن مستقبل (تقریر)
7۔ الفاظ کی حرمت رکھنے والا شاعر۔ ایاز گل (تقریر)
8۔ میرا معاون۔ محمد علی حداد (تقریر)
9۔ مرنا ہر ایک کو ہے (تقریر)
10۔ سندھی ادیب کا کردار اور سندھی ادبی سنگت (تقریر)
11۔ اہلِ دل اور بیوروکریٹ (تقریر)
12۔ کلہوڑا دور طنز و مزاح (تقریر)
13۔ نئی نسل کو سلام (تقریر)
14۔ الفاظ کا مصور۔ انیس انصاری (تقریر)
15۔ تاریخ مخاطب ہے (تقریر)

اس کتاب میں شامل تقاریر اور لیکچرز کے علاوہ تنویر عباسی کی اور بھی کئی ان گنت تقاریر تھیں

جو مختلف ادبی نشستوں اور پروگراموں میں انہوں نے کی تھیں جو کہ ریکارڈ نہ ہوسکیں۔
شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی خیرپور کے اساتذہ کی تنظیم کی طرف سے منعقدہ پروگرام میں انہوں نے ایک یادگار تقریر بہ عنوان "شاہ لطیفؒ کی شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر" کی تھی جو کہ ان کی کتاب "شاہ لطیفؒ کی شاعری" میں موجود ہے۔ سندھی ادبی سنگت، سکھر کی جانب سے اسلامیہ کالج سکھر میں انہوں نے شاہ کے کلام پر جامع لیکچر دیا تھا جو کہ کیسٹ میں محفوظ ہے لیکن تحریری شکل میں نہ آسکا ہے۔ 1993ء میں سندھی ادبی سنگت مرکز کی گزارش پر انہوں نے "سندھی شاعری کی فنی تربیت" کے موضوع پر جامع لیکچر دیا تھا، جسے نامور شاعر اور براڈ کاسٹر مختیار ملک نے ریکارڈ کیا تھا اور اول سومرو نے سنگت مرکز کی طرف سے آڈیو کیسٹ کی شکل میں جاری کیا تھا۔ یہ آڈیو کیسٹ، نئے شعراء کے لیے، نہایت مفید ثابت ہوئی۔ کتاب میں شامل تنویر عباسی کی ان تقاریر اور لیکچرز کا تجزیہ کیا جائے تو ہر لیکچر اور تقریر سے ان کی قابلیت اور علمیت عیاں ہوتی ہے۔ وہ ایک جینئس شاعر اور دانشور تھے اور دلائل کے بغیر انہوں نے کوئی بھی رائے نہیں دی ہے۔ ان کی تقاریر و لیکچرز میں سے کچھ اقتباسات دیتے ہیں:

"سندھی ادبی سنگت گر نہ ہوتی تو آج سکولوں میں سندھی زبان صرف چوتھی جماعت تک پڑھائی جاتی۔" (ص۔ 70)

"اُستاد عاشق علی خاں پہلے فن کار تھے جنہوں نے شاہ لطیفؒ کی وائی: جادولا گے من میں، سندھڑی کے راگ میں گائی، اس کے بعد اُستاد منظور علی خاں تھے، جنہوں نے نہ صرف اس اسٹائل کو آگے بڑھایا بلکہ اُسے مستقل بھی دیا۔ اس سے پہلے اُستاد الحنذ تونو ناری تھے، اب عابدہ پروین ہے۔" (ص۔ 21)

"شیکسپیئر دانشور طبقے کا شاعر ہے، اُن کو انگلینڈ کا عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح اقبال اور غالب کو ان پڑھ اردو طبقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن شاہ لطیفؒ ایسا شاعر ہے جو ایک چرواہے سے لے کر علامہ آئی آئی قاضی جیسے اعلیٰ دانشور تک سب کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ ایسی شہرت اور ہر دل عزیزی بہت ہی کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔" (ص۔ 22)

"میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ادب، سیاست کی رہنمائی کرتا ہے، سیاست کے پیچھے نہیں چلتا، کیوں کہ سیاست دان وسیع النظر نہیں ہوتے، وہ جلدی فوائد حاصل کرنے کا سوچتے ہیں۔" (ص۔ 70)

"سچل سرمست پہلے شاعر تھے جنہوں نے عام لوگوں اور حکومتِ وقت کو خبردار کیا کہ مغربی دشمن آ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ ہم سب ہندو مسلم یک جا ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔" (ص۔ 93)

انٹرویوز

تنویر عباسی نے اپنی زندگی میں کئی انٹرویوز دیے۔ ان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ ان کے انٹرویوز روزنامہ اخبارات اور دیگر جرائد اور مخزن میں شائع ہوئے۔ ان انٹرویوز کی تفصیل اس طرح ہے۔

1۔ ماہنامہ سوجھرو، کراچی، جنوری 1974ء — انٹرویو: گل بانو سلطان

2۔ روزنامہ ہلال پاکستان — انٹرویو: فقیر محمد لاشاری
کا مخزن، کراچی، اگست 1983ء

3۔ ادبی سلسلہ "آرسی" حیدرآباد، جولائی 1984ء — انٹرویو: طارق اشرف

4۔ ماہنامہ "ہروز" کراچی، دسمبر 1990ء — انٹرویو: انعام شیخ اور ایاز گل

5۔ روزنامہ ہلال پاکستان، کراچی، 9 مارچ 1991ء — انٹرویو: غفار مہر

6۔ روزنامہ عوامی آواز، کراچی، 2 اگست 1991ء — انٹرویو: امام راشدی

7۔ ہفتہ وار "عبرت مخزن" حیدرآباد، 1 جنوری 1992ء — انٹرویو: جامی چانڈیو اور مرتضیٰ سیال

8۔ ماہنامہ "ہزارداستان" حیدرآباد، فروری 1992ء — انٹرویو: مظفر نظامانی، الطاف عاصی اور عطا حسین لاکھو

9۔ ماہنامہ "سنگھر" حیدرآباد، جنوری 1994ء — انٹرویو: ناز سنائی، آسی زمیمی اور الطاف ملکانی

10۔ ہفتہ وار "سندھو" حیدرآباد، 17 اگست 1994ء — انٹرویو: ایاز گل، ممتاز بخاری

11۔ روزنامہ "کاوش" حیدرآباد، 26 نومبر 1994ء — انٹرویو: زینت بھٹی

12۔ ماہنامہ "پارس" حیدرآباد، اپریل 1995ء — انٹرویو: ناصر پنہوار اور مہر خادم

13۔ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، شمارہ نمبر 13,14,15، جلد 4 — انٹرویو: خالد اقبال یاسر

14۔ روزنامہ "کاوش" حیدرآباد، 28 اکتوبر 1999ء — انٹرویو: نثار کھوکھر

نثار کھوکھر نے تنویر عباسی سے وفات سے قبل انٹرویو لیا تھا جو کہ ان کی وفات کے تیسرے روز اخبار میں

شائع ہوا، جو تنویر کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ ان انٹرویوز میں طارق اشرف اور فقیر محمد لاشاری کے کیے گئے انٹرویوز کچھ زیادہ تفصیلی ہیں۔ تنویر عباسی نے ان سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات نہایت مفکرانہ انداز میں دیے ہیں اور ان جوابات کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا، وہ دنیا کی ادبی تحریکات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عالم ادیب اور دانشور کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اداروں سے وابستگی

بزمِ صوفیائے سندھ

خدامِ سندھ نے یہ بزم قائم کی، جس کے روحِ رواں جی ایم سید تھے۔ اس بزم کے بنیادی مقاصد، عالمی امن اور بنی نوع انسان کی اجتماعی فلاح و بہبود و ترقی، رواداری اور اخصا تھے۔ اس بزم نے 1966ء سے لے کر 1969ء تک مختلف صوفیائے کرام کی درگاہوں پر دس کانفرنسوں کا انعقاد کیا اور ان میں پیش کیے گئے خطبات کو کتابی شکل میں شائع بھی کیا۔ شیخ ایاز اور رسول بخش پلیجو کے ساتھ تنویر عباسی بھی اس بزم کے سرگرم رکن تھے۔ جی ایم سید بزم کے صدر اور رسول بخش پلیجو سیکرٹری تھے۔ بزم کی ورکنگ کمیٹی میں، قاضی فیض محمد، پیر حسام الدین راشدی، شیخ ایاز، غلام محمد گرامی، حفیظ قریشی اور دیگر ارکان کے ساتھ تنویر عباسی بھی شامل تھے۔ بزم کی طرف سے تنویر عباسی اور سید محمد باقر شاہ پر یہ ذمہ داری رکھی گئی تھی کہ وہ سچل سرمست کی درگاہ پر کانفرنس کا انعقاد کریں گے۔ بزم کے منشور میں یہ مقاصد شامل تھے۔

1۔ سندھ کے کلچر کی ترقی و تبلیغ کے لیے کام کرنا۔
2۔ پیغامِ سندھ، اتحاد، امن اور انسانی فلاح کو پھیلانا۔
3۔ مذہبی رواداری اور انسانی برابری کو عام کرنا۔
4۔ اسی پیغام کو عام کرنے کے لیے سندھ کے درویشوں کے میلوں پر کانفرنسوں کا اہتمام کرنا۔
5۔ درگاہوں کے ساتھ صحت مند روابط قائم رکھنا۔
6۔ لوگوں میں خود غرضی، قومی شعور کی عدمِ موجودگی، نفاق اور کم ہمتی کو دور کرنے کی کوششیں کرنا۔
7۔ کارکنوں کی تربیت کے لیے مراکز قائم کرنا۔
8۔ سیاسی خلفشار سے علیحدہ رہنا۔

تنویر عباسی نے اس بزم کے پلیٹ فارم پر نمایاں خدمات سرانجام دیں اور بزم کے پیغام کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ضلع خیر پور میں کوٹ بنگلہ کے نزدیک اُبھن شاہ کی درگاہ ہے، جہاں پر بھی بزمِ صوفیائے سندھ کی جانب سے ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا، جس میں مشہور شاعر تاجل بیوس نے تنویر عباسی کی دعوت پر پہلی مرتبہ حصہ لیا تھا۔ تنویر عباسی نے ہر پلیٹ فارم سے نوجوان شعراء کی ہمت افزائی کی۔

بزمِ خلیل ،حیدر آباد

ذوقِ شاعری کی بدولت تنویر عباسی سب سے پہلے بزمِ خلیل، حیدر آباد سے وابستہ ہوئے۔ یہ بزم مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل کے نام سے منسوب تھی اور وہ ہی اس کے روحِ رواں تھے۔ تنویر عباسی اس زمانے (53-1952ء) میں پھلیلی کے کنارے قائم گورنمنٹ کالج میں شعبہ سائنس کے پری میڈیکل کے طالب علم تھے۔ بزمِ خلیل کے مشاعرے اس وقت کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے، جن میں سندھی اور اردو زبانوں کے شعراء حصہ لیتے تھے اور مصرع طرح بھی سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں دیا جاتا تھا۔ اس بزم نے 23 مارچ 1952ء کو جمعیت الشعراء سندھ کے اجلاس کے موقع پر ایک بڑے مشاعرے کا انعقاد کیا تھا۔ بزم کے شاعروں میں، اس وقت کے نامور شعراء رشید احمد لاشاری، مظفر حسین جوش، منظور نقوی، عبداللہ خواب، اللہ بخش سرشار عقیلی، محمد بخش واصف، عبدالقیوم صائب اور محمد جمن حالو شریک ہوا کرتے تھے۔ تنویر عباسی بزم کی نشستوں میں جاتے تھے اور وہاں ان کی دوستی مظفر حسین جوش، منظور نقوی، سرور علی اور دیگر شعراء سے ہوئی۔ اس وقت شاعری میں وہ اپنا تخلص مفتوح استعمال کرتے تھے اور شعر و شاعری میں ڈاکٹر ابراہیم خلیل سے رہنمائی لیتے تھے۔

سندھی ادبی سنگت

ترقی پسند تنظیم سندھی ادبی سنگت سے تنویر عباسی کا تعلق، لیاقت میڈیکل کالج جام شورو میں دورانِ تعلیم قائم ہوا۔ وہ حیدر آباد شاخ کے ممبر تھے اور اس کی تنقیدی نشستوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سندھی ادبی سنگت کا قیام جولائی۔ اگست 1947ء میں کراچی میں ہوا۔ گوبند مالھی اس کے پہلے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سوبھو گیانچندانی، شیخ ایاز، موھن پنجابی، آسانند مامتورا، پروفیسر ایم یو ملکانی اور دیگر کئی ادیب اور دانشور اس تنظیم کے بنیادی ارکان بنے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، تنظیم کی سرگرمیاں معطل رہیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں مرکزی تنظیم سازی کے بعد یہ تنظیم سندھ میں پھیل گئی اور اس نے سندھی

زبان وادب کی ترقی وترویج میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ حیدرآباد میں تنویر عباسی اور سنگت کے دیگر ساتھیوں کی ملاقاتیں اکثر کراچی ہوٹل میں ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں چار دوستوں کی ''چویاری'' مشہور تھی اور وہ چار ادیب وشاعر دوست تھے: غلام ربانی آگرو، نیاز ہمایونی، رشید بھٹی اور تنویر عباسی۔ سندھی ادبی سنگت حیدرآباد سے تنویر عباسی کے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو لکھتے ہیں:

> ''1956ء میں تین سال ضائع کرنے کے بعد، میٹرک پاس کر کے میں حیدر آباد کے سٹی کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے چکا تھا۔ اس وقت میرے دو تین اشعار، مضامین و افسانے شائع ہو چکے تھے۔ ادب سے نیا نیا لگاؤ ہوا تھا۔ آدھے مہینے کے بعد سندھی ادبی سنگت کی تنقیدی نشستوں کے بارے میں خبر ہو چکی تھی۔ ایک شام کو پتہ پوچھتا ہوا، بسنت ہال کے گیٹ تک جا پہنچا۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ وہ نشستیں ہر جمعہ کی شام پانچ بجے منعقد ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ہال کے اندر اور کبھی باہر باغیچہ میں چبوترے کے گرد سیمنٹ کے بینچوں پر محفلیں جمتی تھیں۔ اُس دن دو دوست بینچوں پر بیٹھے تھے، میں سلام کر کے ایک بینچ پر جا کر بیٹھا اور اپنا تعارف کروایا۔ انہوں نے بھی باری باری اپنے نام لیے: تنویر عباسی، ممتاز مرزا۔ وہ تنویر عباسی سے میری پہلی ملاقات تھی۔''

(تنویر عباسی ایک مطالعہ صفحہ ۔۔)

تنویر عباسی کی سندھی ادبی سنگت کے ساتھ بچی وابستگی آخر دم تک قائم رہی۔ وہ سنگت کے ایک مخلص کارکن ورہنما تھے۔ سندھی زبان کے لیے دستخطی مہم، یوم سندھی زبان کی تحریک ہو یا وزلسٹ سندھی میں لکھنے کا مطالبہ ہو، تنویر عباسی ہر مہم میں پیش پیش رہتے تھے۔ 14 اکتوبر 1962ء کو جامعہ عربیہ ہال تک چاڑھی، حیدرآباد میں سندھ سنگت کی ڈیلیگیٹ کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی صدارت محمد عثمان ڈیپلائی نے کی۔ شمشیر الحیدری نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ تنویر عباسی، غلام ربانی، مقبول بھٹی، ناصر مورائی، عبدالوحید صدیقی اور دیگر حضرات نے سندھی زبان کے مسائل کے بارے میں تقاریر کیں۔ اس کانفرنس میں ''یوم سندھی زبان'' منعقد کرنے کی تجویز منظور کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ سارے سندھ کا دورہ کر کے ایک تحریک چلائی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے ایک ''ایکشن کمیٹی'' تشکیل دی گئی، جس میں شمشیر الحیدری، تنویر عباسی اور ناصر مورائی کو مقرر کیا گیا۔ ''یوم سندھی زبان'' سندھ کے مختلف شہروں میں منایا گیا، لیکن اس سلسلہ میں سب سے بڑا اجتماع حیدرآباد میں ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر غلام حسین جعفری، چیئرمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، حیدرآباد نے کی۔ 9 نومبر 1962 کو سردار بہادر محمد بخش حال تلک چاڑھی میں منعقدہ اس اجلاس میں تنویر عباسی نے اپنا

خصوصی مقالا پیش کیا۔ حیدر بخش جتوئی نے اپنی انقلابی شاعری سے حاضرین کے جذبات کو جگایا۔ تنویر عباسی کا لکھا ہوا '' سنڌيءَ جو ترانو ''، مشہور فنکار فقیر عبدالغفور نے گا کر محفل کو گرما دیا۔ تنویر عباسی کے اس ترانہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور پورے سندھ میں اُس کی گونج پھیل گئی۔ تنویر عباسی کا سنڌيءَ جو ترانو ''سندھی کا ترانہ'' سندھی میں اور پھر اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

سنڌيءَ جو ترانو

شال جيئي هيءَ منڙي ٻولي
جنهن ۾ ماءُ ڏني هئي لولي
لفظ اُنهيءَ جا موتيءَ داڻا
جملا جواهر جيان سيباڻا
تن سان پربل آ سنهنجي جهولي
شالَ جيئي هيءَ منڙي ٻولي
اهڙي سندرتا اهڙي سڌرتا
جنهن کو دريا اُٿلي پيو آ
جنهن تہ جُلي پيئي ڪا چولي
شالَ جيئي هيءَ منڙي ٻولي
سارو جڳ پيل زور لڳائي
سنڌي سگهندو ڪونہ هٽائي
هاڻي مون اک آهي کولي
شالَ جيئي هيءَ منڙي ٻولي
جنهن ۾ ماءُ ڏني هيءَ لولي

ترجمه:

سدا جیوے یہ سندھی بولی
ماں نے دی ہے جس میں لوری
ہیرے موتی لفظ اسی کے
علم ادب اور میری جس سے
بھری رہے گی ہردم جھولی

سدا جیوے یہ میٹھی بولی
سارا جگ بھی زور لگائے
سندھی کو اب کون مٹائے
میں نے آنکھ ابھی ہے کھولی
سدا جیوے یہ میٹھی بولی
اتنی سندرتا اتنی مدھرتا
مستی میں ہو جیسے دریا
جیسے سمندر کی ہو چھولی
سدا جیوے یہ میٹھی بولی

12 اکتوبر 1966ء کو 17 اور نگزیب مارکیٹ کراچی میں سندھی ادبی سنگت، سندھ کونسل کا سالانہ عام اجلاس زیرِ صدارت مشہور شاعر عبدالکریم گدائی ہوا۔ اس موقع پر دیگر امور کے ساتھ سنگت کے مرکزی الیکشن بھی ہوئے، جن میں تنویر عباسی کو سنگت کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ تنویر عباسی کے ساتھ دیگر عہدیداران تھے: پروانہ بھٹی (جوائنٹ سیکرٹری)، حمید سندھی (خزانچی)، تاج بلوچ (آڈیٹر)۔ تنظیم میں مقبولیت اور ان کے کام کی وجہ سے تنویر عباسی کو یہ اہم ذمہ داری سونپی گئی اور انہوں نے نہایت ایمانداری اور لگن کے ساتھ اس فرض کو نبھایا۔

سندھی ادبی سنگت سے اپنی وابستگی اور اس تنظیم کی انفرادیت کے بارے میں تنویر عباسی لکھتے ہیں:

> ''1956-57ء میں ہم نے سندھی زبان کے لیے سنگت کے پلیٹ فارم پر دستخطی مہم چلائی تھی۔ اس زمانے میں سندھ کا ایک سیاست دان، پانچ ہزار روپے کا چیک لے کر ہماری تنظیم سندھی ادبی سنگت کو دینے آیا تھا۔ اُس وقت ہماری حالت یہ تھی کہ ہم کراچی ہوٹل میں اُدھار پہ کھانا کھاتے تھے اور مہینے کا بل تین سو روپے آتا تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ پانچ ہزار روپے اُس وقت کتنی اہمیت رکھتے تھے، لیکن ہماری تنظیم کے سیکرٹری مقبول بھٹی نے سیاست دان کو چیک واپس کرتے ہوئے کہا'' ہم یہ چیک آپ سے کبھی نہ لیں گے۔ ہم چیک لے کر آپ کے ہاتھوں استعمال نہیں ہونا چاہتے۔ ہم یہ غلطی نہیں کریں گے۔'' وہ کیا قربانی واحساس کا دور تھا!۔''

(تنویر عباسی۔ ''سپنے سے خوب صورت حقیقت''۔ ص 47)

سندھ فورم

تنویراوران کے دیگر ساتھیوں نے ون یونٹ مخالف تحریک میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ون یونٹ کے خاتمے کے بعد،سندھ کے سیاسی، سماجی وادبی افق پر جو نئے آثار رونما ہونے لگے تھے،وہ ان کا شعور بھی رکھتے تھے۔ نئے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی دھرتی، اس کی زبان اور معاشی مسائل کی ترقی وتحفظ کے لیے،تنویراوران کے ساتھیوں نے''سندھ فورم'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔1972ء میں قائم کردہ اس فورم کے کنوینز،شیخ ایاز، رشید بھٹی،تنویرعباسی، رشید آخونداور سراج الحق تھے۔یہ سب لوگ ادب کی دنیا کے روشن ستارے تھے اور ہرایک کی اپنی علیحدہ علیحدہ شناخت تھی۔ان کنوینرز نے مل کر، سارے سندھ میں اپنے ہم خیال ساتھی تلاش کیے اوردھرتی کے حقوق کے لیےفکری وعملی محاذ پر جمع ہونے لگے۔انہوں نے اپنا اعلان نامہ جاری کیا۔سندھ فورم کے نمایاں مقاصد یہ تھے:

1۔ سندھی زبان کی ترقی کے لیے سرکاری سطح پر ایک مستقل کمیشن قائم کرانا۔

2۔ ایوب شاہی کے دور میں انعامات میں دی گئی زمینیں سندھ حکومت کو واپس دلانا۔

3۔ سکھر یا خیر پور میں نئی یونیورسٹی اور میڈیکل کالج قائم کرنا۔

4۔ سندھ کے دیہات میں بالغان کی تعلیم لازمی قرار دلانا۔

5۔ سندھ میں میٹرک تک تعلیم مفت اور لازمی کرانا۔

6۔ ہر نئے ڈاکٹر کو پابند بنانا کہ وہ کم از کم تین سال تک کسی دیہات کے ہسپتال میں ڈیوٹی کرے گا۔

7۔ سندھ کی تمام لائبریریوں میں سندھی کتب واخبارات کالازمی بندوبست کرانا وغیرہ۔

سچل سرمست یادگار کمیٹی

حیدرآباد سے خیر پور ہجرت کے بعد،تنویر، یہاں کے سماجی، علمی وادبی حلقوں میں شامل ہوگئے۔بزم صوفیائے سندھ کی جانب سے ان پر سچل سرمست کی درگاہ پر پروگرام منعقد کرانے کی ذمہ داری رکھی گئی تھی۔اس قسم کی تقریبات درازاشریف میں شروع ہوگئیں۔سچل سرمست کوآپریٹوا کادمی کے پلیٹ فارم پر ھادی بخش لاڑک، قائم علی شاہ، غوث علی شاہ ودیگر ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کرتنویر نے سچل کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کوششیں شروع کردیں۔آگے چل کر یہ اکادمی،'' سچل سرمست یادگار

کمیٹی" میں تبدیل ہوگئی۔ سچل سرمست کے سالانہ عُرس کے موقعے پر ادبی کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات و شاعری کو محفوظ کرنے کے لیے یادگار کمیٹی کی جانب سے "سرمست" مخزن کا اجراء کیا گیا۔ بحیثیت سیکرٹری، سچل سرمست یادگار کمیٹی، تنویر عباسی نہ صرف سالانہ کانفرنس و مشاعرہ کا اہتمام احسن طریقے سے کرتے رہے بلکہ "سرمست" مخزن کا اجراء بھی باقاعدہ ہوتا رہا۔ "سرمست" کی اشاعت کا سلسلہ 1980ء سے، ان کی وفات کے سال 1999ء تک جاری رہا۔ "سرمست" کی اشاعت میں محمد علی حداد اور قربان منگی اُن کے معاونین رہے۔

سچل سرمست یادگار کمیٹی کی جانب سے کچھ کتب بھی شائع ہوئیں۔ جن میں محمد علی حداد کی "سچل بیلو ٹُرانی" کے علاوہ ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو کی کتاب "سچل لغات" ڈاکٹر نواز علی شوق کی تین کتب "فقیر محمد صلاح"، "کلام فقیر عبداللہ کا تیار" اور "عطار سندھ" شامل ہیں۔ یادگار کمیٹی ضلعی سطح پر ایک سرکاری فورم ہے۔ پہلے ڈپٹی کمشنر اور آج کل ڈی سی او اس کے چیئرمین ہوتے ہیں۔

پوئٹری سوسائٹی لندن

مشہور عالم و مفکر علامہ آئی آئی قاضی، پوئٹری سوسائٹی لندن کے ممبر تھے۔ انہوں نے خیر پور میں 1924ء میں اس کی برانچ قائم کی تھی۔ خیر پور ریاست کے والی، میر علی نواز ناز جو کہ سندھی اور اردو کے اچھے شاعر تھے، انہوں نے بھی پوئٹری سوسائٹی لندن کی ممبر شپ حاصل کی تھی اور خیر پور برانچ کے سرپرست تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُسی خیر پور ریاست کے نامور فرزند تنویر عباسی نے پوئٹری سوسائٹی میں بحیثیت ممبر شمولیت اختیار کی۔ جب وہ لندن کی سیر پر گئے تو وہاں پوئٹری سوسائٹی کی میٹنگ میں شریک ہوئے اور ممبر شپ حاصل کی۔ وطن واپس آنے کے بعد بھی ان کا رابطہ سوسائٹی سے رہا اور ان کے جاری کردہ مخزن "پوئٹری" اور "پوئٹری ریویو" انہیں بذریعہ ڈاک یہاں ملتے رہے۔ تنویر عباسی سوسائٹی کی کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔ "پوئٹری" مخزن میں ساری دنیا کی شاعری کی کتب کا تذکرہ ہوتا ہے کہ فلاں ملک میں شاعری کی کون کون سی کتب شائع ہوئی ہیں۔ پوئٹری سوسائٹی کا اپنا ایک کتاب گھر بھی ہے اور سوسائٹی کے ہفتہ وار اجلاسوں میں ہر ممبر پچاس پیسے جمع کرا کے شریک ہوتا ہے۔ وہاں کی ایک شاعرہ ایلی برس فورڈ کے ساتھ ایک نشست میں تنویر عباسی بھی شریک ہوئے تھے اور بحث میں حصہ لیا تھا۔ تنویر عباسی کی یہ انفرادیت تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی رہے خود کو متحرک رکھا۔

سچل چیئر

تنویر عباسی کی یہ تمنا تھی کہ وہ کسی ادبی ادارے میں رہ کر کوئی تحقیقی کام بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ کریں۔ جب انہیں 1988ء میں بطور صلاح کار اور ڈائریکٹر، سچل چیئر شاہ عبداللطیف کیمپس مقرر کیا گیا تھا، تو ان کے پاس چیئر کو ایک مثالی ادارہ بنانے کے لیے کئی منصوبے تھے۔ انہوں نے نہایت سچائی اور وابستگی کے ساتھ کام کی اور سچل چیئر کو ایک کمرے سے نکال کر ایک بڑی بلڈنگ میں لے آئے، جہاں پر لائبریری، آڈیو وڈیو لائبریری کے ساتھ ایک میوزیم بھی قائم کیا گیا، جس میں نایاب قلمی نسخے اور شاہ حسین، سچل سرمست و دیگر مشاہیر کے سچل سرمست کے حوالے سے کیے گئے کام کو نمایاں طور پر رکھا گیا۔ تنویر نے چیئر میں اشاعتی کام کو فروغ دینے کے لیے تحقیقی جرنل "آشکار" جاری کرنے کے ساتھ، کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس ضمن میں محمد علی حداد اور ایاز گل اُن کے معاون تھے۔ تنویر چھ سال تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ اس عرصہ میں چیئر نے "آشکار" کے چار شمارے، حمید سندھی کی کتاب "کاش کہ آتے تم"، رشید بھٹی کی "سچل کا مکتب"، آغا سلیم کی کتاب "منتخب کلام سچل سرمست (اردو ترجمہ)" اور تنویر عباسی کی مرتب کردہ انگریزی کتاب "سچل سرمست" شائع کی۔

سچل چیئر کی خوب صورت عمارت، جس کا افتتاح نامور عالم و ادیب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے 1991ء میں کیا تھا، کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ جب تنویر عباسی نے وہاں بیٹھ کر سچل سرمست کے کلام کے فروغ کے لیے کئی پروگرام مرتب کیے۔ انہوں نے 1989ء میں سچل سیمینار کا انعقاد کیا جو کہ ایک یادگار و تاریخی پروگرام تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ سچل سرمست کا ایک جامع اور مستند رسالہ (مجموعۂ کلام) شائع ہو۔ یہ اہم تحقیقی کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا اور سچل سرمست کے موجود رسائل اور کئی قلمی نسخوں کی مدد سے ایک معیاری مجموعۂ کلام مرتب کرنے میں معروف ہو گئے۔ یہ ایک محنت طلب اور ایک عالمانہ تحقیقی کام تھا جو کہ نوے فیصد تنویر نے سرانجام دے دیا تھا لیکن بعد میں سچل چیئر سے تنویر عباسی کو جبراً فارغ کیا گیا اور وہ تحقیقی کام کبھی مکمل نہ ہو سکا اور آج تک پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پایا ہے۔ وہ اس ادارے کے تاحیات اعزازی پروفیسر بھی تھے۔

پاکستان رائیٹرز گلڈ

شیخ ایاز، رشید بھٹی اور تنویر عباسی پاکستان رائیٹرز گلڈ سے کافی عرصہ وابستہ رہے۔ گلڈ نے مختلف پاکستانی

زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے مواقع فراہم کیے، اس طرح وہ ایک دوسرے کی زبان و ادب سے تعارفی حد تک آشنا بھی ہوئے۔ گلڈ نے پاکستانی زبانوں اردو، سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور گجراتی وغیرہ کی نہ صرف کتب شائع کیں بلکہ ان کو ادبی انعامات بھی دیے۔ تنویر عباسی کی بھی گلڈ سے وابستگی رہی اس حوالے سے ان کی تنیل شفائی، شفقت تنویر مرزا اور دیگر ادیبوں سے دوستی بھی رہی۔ وہ مختلف شہروں میں منعقدہ گلڈ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔ سندھی زبان کو جب مشکلات کا سامنا ہوا اور اس کی تعلیمی حیثیت ختم ہوگئی تو سندھی ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے گلڈ کے سرکاری کردار کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس سے اپنا تعلق ختم کردیا۔ اس کے بعد تنویر عباسی اور ان کے دیگر ساتھیوں نے اپنی ساری سرگرمیوں کا مرکز سندھی ادبی سنگت ہی کو بنالیا۔

شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی

شاہ لطیفؒ یونیورسٹی سے تنویر کا تعلق کئی حوالوں سے رہا، جو ان کی وفات تک قائم رہا۔ چکل چیئر کے علاوہ، وہ یونیورسٹی کے مختلف اداروں، سینڈیکیٹ، سلیکشن بورڈ اور بورڈ آف اسٹڈیز سے بطور ممبر وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے وہ ریسرچ گائیڈ بھی تھے۔ ان کی رہنمائی میں ڈاکٹر بدر اُجن، ڈاکٹر انور فگار، ڈاکٹر یوسف خشک اور ڈاکٹر ادل سومرو نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کے گائیڈ بھی تھے۔

دیگر اداروں سے وابستگی

1- ممبر، بورڈ آف گورنرز، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔
2- ممبر، صلاح کار بورڈ، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی، جام شورو۔
3- ممبر، شاہ عبداللطیفؒ کلچرل کمیٹی، بھٹ شاہ۔
4- ممبر، پبلی کیشن کمٹی، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی، جام شورو۔
5- سیکرٹری، چکل سرمست یادگار کمیٹی، حیدرآباد۔
6- ممبر، بورڈ آف اسٹڈیز، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔
7- ممبر، بورڈ آف گورنرز، سندھی لینگویج اتھارٹی، حیدرآباد۔
8- ممبر، سلیکشن بورڈ، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیرپور۔

9- ممبر، صلاح کار بورڈ، شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی، چیئر، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

10- ممبر، بورڈ آف گورنرز، سندھی ادبی بورڈ، جام شورو۔

11- ممبر، بورڈ آف اسٹڈیز، سندھی شعبہ، کراچی یونیورسٹی۔

12- ممبر، سینڈیکیٹ، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور۔

13- سرپرستِ اعلیٰ، سندھ بالک سنگت، خیر پور۔

14- ممبر، اسکروٹنی کمیٹی، سندھی شعبہ، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور۔

15- گائیڈ اسکالر (ایم فل اینڈ پی ایچ ڈی) سندھی شعبہ، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور۔

16- اعزازی ممبر، پاک۔ چائنہ رائیٹرز ایسوسی ایشن۔

17- ممبر، بورڈ آف ایجوکیشن، سکھر۔

18- ممبر، پوئٹری سوسائٹی، لندن۔

علمی و ادبی ایوارڈ و اعزازات

1- بہترین شاعری پر پاکستان رائیٹرز گلڈ ایوارڈ، 1970ء
2- بہترین شاعری پر انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی ایوارڈ، 1985ء
3- چچل سرمست ایوارڈ، 1986ء
4- سندھ گریجوئٹس ایسوسی ایشن گولڈ میڈل، 1989ء
5- لطیفؒ اکادمی گولڈ میڈل، 1990ء
6- تمغۂ امتیاز، حکومتِ پاکستان، 1991ء
7- نارائن شیام ایوارڈ، انڈیا، 1992ء
8- بہترین شاعر، سندھی ادبی سنگت ایوارڈ، 1997ء
9- شاہ عبداللطیفؒ ایکسیلنس ایوارڈ حکومت سندھ، پاکستان 2007
10- پرائیڈ آف پرفارمنس (ادب اور شاعری) حکومت پاکستان 2007

ناقدین و معاصرین کی رائے

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحیم ملک

تنویر عباسی سے میری دوستی تھی، ہم علم وادب کے سفر میں ہمیشہ ساتھ رہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ تنویر عباسی، اپنے اظہار، رویے اور گفتگو میں رومانٹک تھے۔ اس لیے ان کی رومانوی شاعری اعلیٰ درجے کی ہے، جس میں ہمیں عشق کا سطحی انداز نظر نہیں آتا۔ تنویر اگر آج ہوتے تو وہ ہمیں کسی مشکل میں تنہا نہ چھوڑتے۔ وہ ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتے تھے اور رہنمائی کرتے تھے۔ اُن کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہر اچھے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے بارے میں بہت فکر مند تھے اور ہمیشہ اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ تنویر بہت بڑے ادیب و دانشور ہونے کے ساتھ ایک بہترین انسان بھی تھے۔ ہم نے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا ہے اور نہ ہی سوچا ہے کہ تنویر ہمارا حصہ نہیں ہے۔ جب تک یہ یونیورسٹی ہے، تب تک تنویر زندہ رہے گا۔

"ہوان شل قبول" "کاش ہو جاؤں قبول"۔

تنویر عباسی کارنر، شاہ لطیف یونیورسٹی، خیرپور، 2005، ص۔ 11)

ڈاکٹر نواز علی شوق

تنویر عباسی بہت ہی محبوب اور میٹھے انسان تھے، جن کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ وہ جب خیرپور آکر بسے تو وہاں کے ادبی ماحول میں ایک انقلاب آگیا۔ انہوں نے نوجوان ادباء وشعراء کی حوصلہ افزائی اور تربیت کی۔ چیل چیئر کے ڈائریکٹر اور چیل یادگار کمیٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے، انہوں نے کئی کتابیں شائع کروائیں اور کانفرنسوں کا اہتمام کیا، وہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ سب ان کی ذاتی دلچسپی، محبت و محنت کا نتیجہ تھا۔ ان کی تیار کردہ ٹیم میں مرحوم ہادی بخش لاڑک، مرحوم محمد علی حداد، ایاز گل، ڈاکٹر ادل سومرو، مختیار ملک اور دیگر نوجوان شامل تھے۔ تنویر کی ذاتی کوششوں سے "سرست" کتابی

سلسلہ جاری ہوا، جس میں پچل سیمینار میں پڑھے گئے مقالات و مضامین شامل ہوتے تھے۔ ان کے ذاتی تعلقات کی بناء پر پچل سیمینار کے موقع پر نامور ادیب و شاعر شریک ہوتے تھے، جن میں پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، شیخ ایاز، ڈاکٹر غلام علی الانا، علی احمد بروہی، ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو، ڈاکٹر عبدالمجید میمن، محمد ابراہیم جویو، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، آغا سلیم، امر جلیل، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو اور غلام ربانی آگرو قابلِ ذکر ہیں۔

(بھٹائی جرنل. 7، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور، ص. 20)

ڈاکٹر بدر اُجن

تنویر عباسی ترقی پسند شعراء کے پُر خلوص حلقے سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم تھے، اُنہوں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر سندھی ادبی سنگت کو فعال بنانے کے ساتھ، سندھی زبان کو قومی زبان بنانے والی تحریک میں ایک مثالی کردار ادا کیا۔ اُنہوں نے ساری زندگی ترقی پسند فکر اور تحریک کو عام بنانے کے لیے کاوشیں کی ہیں اور اس سلسلے میں وہ بے شمار مذاکروں، محافل، مشاعروں اور سیمینارز میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے عمل سے ایک فعال اہلِ قلم ہونے کی مثال قائم کی ہے۔

(سندھی ادب میں تنقید نگاری، سندھ ریڈرز فورم، حیدر آباد، 1999ء، ص. 519)

فتاح ملک

تنویر عباسی ایک سچے اور مخلص دوست تھے۔ جتنے وہ بظاہر معصوم نظر آتے تھے، ان کا دل بھی اتنا ہی شفاف تھا۔ ادب سے کمیٹڈ تھے۔ سندھی زبان سے ان کا عشق تھا۔ جب زبان پر مشکل حالات آئے تو تنویر نے سندھ کے اور سندھی زبان کے گیت لکھ کر سوئے ہوئے عوام کو بیدار کیا۔ سندھی ادبی سنگت کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اپنا ایک مثالی کردار ادا کیا اور بطور سیکرٹری جنرل اس تنظیم کو بہتر انداز میں منظم کیا۔ ان کی قربانی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

سید مظہر جمیل

تنویر عباسی قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھے اور انہوں نے سندھی ادب میں جدید تصورات و رجحانات کی تعمیر و توسیع میں نہایت اہم کردار ادا کیے ہیں۔ تنویر عباسی صرف شاعر نہ تھے بلکہ وہ ایک کامیاب و

مصروف معالج ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے۔ تنویر عباسی نے نثر میں بھی اتنا وقیع ذخیرہ چھوڑا ہے کہ اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ تحقیق وتنقید کے شعبے میں بھی انہوں نے کئی کتابیں چھوڑی ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری پر تحقیقی وتنقیدی مضامین تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ نانک یوسف کے کلام کا انتخاب، تحقیقی وتنقیدی جائزہ 1982ء میں کیا اور خیر محمد ہسبانی کے کلام کا انتخاب وتحقیقی و تنقیدی جائزہ 1983ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس واقعے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ سندھی کے کلاسیکل شعروادب پر ماہرانہ تصرف رکھتے تھے اور جدید ادب کو قدیم زندہ ادبی روایت سے ہم کنار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد تراجم بھی کیے ہیں۔ ایک ویت نامی ناول کا ترجمہ 1973ء میں پہلی مرتبہ چھپا تھا اور جس کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بے شمار تنقیدی مضامین، خاکے، یادداشتیں، انٹرویو، سفرنامے، تقاریر، مھاگ (دیباچے) اور دوسری تحریریں جن میں سے بہت تھوڑا حصہ کتابی صورت میں سامنے آسکا ہے۔ اس کے علاوہ چِل سرمست یادگاری کمیٹی کے زیر اہتمام چِل سرمست کی سالانہ تقریب پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل نو مجموعے بھی ترتیب دیے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے تحقیقی کاموں میں سب سے زیادہ اہم کام شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالوں کے قلمی نسخوں پر ہے، اس سرسری جائزے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تنویر عباسی کس درجہ تنومند تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

تنویر عباسی ایک کمیٹڈ اور باشعور سماجی کارکن، دانشور اور تہذیبی نمائندہ بھی تھے۔ وہ اپنی طالب علمی ہی سے سندھ کی سیاسی، سماجی وتہذیبی سرگرمیوں میں متحرک رہے ہیں اور سندھ میں چلنے والی ہر ترقی پسند اور روشن خیال تحریک میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ سندھی ادبی سنگت کے قیام اور اس کی فعال تنظیم میں تنویر عباسی کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ وہ ون یونٹ کے خلاف قومی جدوجہد کرنے والوں کی صف اوّل میں شریک تھے، سندھی زبان وادب میں زندگی آمیز اور زندگی آموز خیالات کے پھیلاؤ میں ان کا گراں قدر حصہ رہا ہے۔ شیخ ایاز کے بعد غالباً وہ دوسرے شاعر ہیں جنہوں نے سندھ کے شاعروں کی نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ بلاشبہ ایک رجحان ساز شخصیت کے مالک تھے۔

تنویر عباسی کی شاعری معروضی سچائیوں اور داخلی احساسات وجذبات کا نہایت مؤثر اور خوب صورت جمالیاتی اظہار ہے۔ انہوں نے "رگون تیون رباب" کے دیباچے میں "سچ" کو اپنی شاعری کی بنیاد قرار دیا تھا، ایک ایسے سچ کو جو خود ان کے وجود اور شخصیت کا حصہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعر کو اپنے جذبات واحساسات کا اظہار خود اپنی زبان اور استعارے میں کرنا چاہیے۔ وہ سندھی شاعری کو فارسی شعریات کے اثرات سے آزاد کرانے کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس تحریک میں نہایت مؤثر کردار بھی ادا کیا ہے۔ چنانچہ تنویر عباسی نے اپنی شاعری کے لیے قدیم کلاسیکل روایت کے رچاؤ کے ساتھ ساتھ جدید طرز احساس اور ندرتِ اظہار کے اشتراک سے ایک جداگانہ اسلوب تراشا ہے۔ نیاز ہمایونی نے

تنویر عباسی کی شاعری کا خیر مقدم کرتے ہوئے، اسے سندھی شاعری کے نئے دور کا سر آغاز قرار دیا تھا۔
امداد حسینی نے تنویر عباسی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"تنویر عباسی کی شاعری کھلے میدانوں اور نئے آفاق فن کی شاعری ہے کہ تنویر پامال راستوں اور بوسیدہ طریقۂ اظہار کو اختیار کرنے کا کبھی بھی قائل نہیں رہا۔"

ڈاکٹر غفور میمن

ڈاکٹر غفور میمن، تنویر عباسی کی شاعری کو روشن خیالی اور ترقی پسند فکر کے تسلسل کا تخلیقی دھارا قرار دیتے ہیں جس میں نہ تو نعرے بازی ہے اور نہ جنونی و جذباتی پن اور جوشیلہ تشنج، بلکہ اس میں ایک فطری و جمالیاتی مدھر آہنگ رواں ہے جو احساس و جذبات میں فکر کی روشنی پھیلاتا جاتا ہے۔ تنویر حقیقت پسند، انسان دوست اور امید پرست شاعر ہے اور ان کی شاعری سے اسی طرح کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ تنویر عباسی کی شاعری میں روشن خیالی اور ترقی پسند فکر کا رجحان ہمیشہ غالب رہا ہے لیکن کہیں کہیں اس میں وجودی فکر کی دھارائیں بھی پھوٹتی ہیں۔ تنویر عباسی کی وجودیت دراصل انسان دوست فکر کا پرتو ہے۔ وہ حسن و جمال، سچائی، پیار اور محبت کا شاعر ہے جسے ہمیشہ صداقت کی تلاش رہی ہے اور جس کی شاعری کا محور انسانیت پسندیت کا آفاقی تصور رہا ہے۔

(جدید سندھی ادب. رجحانات، میلانات و امکانات، اکادمی بازیافت)

پروفیسر اعجاز قریشی

سندھ کے جاگیردارانہ سماج میں ڈاکٹر تنویر عباسی مرد مجاہد کا خاکہ ہیں۔ وہ لغوی، لفظی اور معنوی اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ یہ وہ سندھ پرست انسان تھے جنہوں نے کبھی بھی اپنے عشق کو تفریق میں نہ لایا۔ ڈاکٹر ڈاکٹر ہوتا ہے وہ نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت۔ ان کی عظمتوں کے پیچھے ان کی شریکِ حیات ڈاکٹر قمر کا بھی اتنا ہی اہم کردار ہے جتنا اُن کا خود کا۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ایسی شریکِ حیات فریج کہانی کار جولس ورنک اور جدید دور کے دانشور کارل مارکس کے علاوہ کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔

(ہونہار کی مٹی میں مدفون سندھ کے اُجالے، ڈاکٹر تنویر عباسی)

(بھٹائی جرنل 7، 2002 تنویر عباسی نمبر، ص:99)

تاج جویو

میں یہ بات کامل یقین سے کہتا ہوں کہ تنویر نے ایک کامیاب، مکمل زندگی گزاری۔ وہ ایک کامیاب شاعر، عالم، محقق تو تھے ہی لیکن وہ ایک کامیاب جیون ساتھی، کامیاب باپ، کامیاب دوست، کامیاب ڈاکٹر اور ایک مکمل انسان تھے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ روشن اور بے داغ انسان تھے۔ اگر ہم تنویر کی زندگی کا تجزیہ کریں تو واقعی ان کی زندگی کا ایک ایک پل صدیوں پر حاوی ہے۔ انھوں نے ایک انسان کی حیثیت سے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری۔ وہ ایک پیار کرنے والے جیون ساتھی تھے۔ قمر اور تنویر ہم معنی، ہم مزاج، ہم نفس وحدت الوجود نور کی مشعل تھے۔ بچوں کے لیے بے پناہ پیار۔ پیارا بچہ سرمد، پیاری پیاری راج دلاری بچیاں، باپ اور بیٹے کا پیارا جواب، باپ اور بچوں کی محبت بے مثال! گھر پہ نظر ڈالو تو جنت، میرواہ کے کنارے پر ہریالی کے بیچ ٹھنڈی ہوائیں گرمی ہو یا سردی روشن گھر! رات کی رانی اور یاسمین کی خوشبو سے معطر گھر! کیا جنت اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے؟

(کوھوجائون قبول۔ ص:29،26)

(تنویر عباسی کارنر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور)

پروفیسر ڈاکٹر یاسمین قاضی

"شروع ہی سے ڈاکٹر تنویر عباسی کا خاندان مجھے Facinate کرتا تھا۔ چھوٹا سا خاندان پھولوں کا مالا کی طرح اپنی Family سے جڑے ہوئے، زندگی کے گلے میں پروئے ہوئے ہار کی طرح لگتا تھا یہ خاندان۔ ڈاکٹر تنویر عباسی اور پارس کی شاعری نے مجھے ان کے اور قریب کر دیا۔۔۔

سرمد گھر، صرف سرمد کا گھر تو نہ تھا وہ تو ہر علم دوست کا گھر تھا ہم اس گھر میں آج بھی اونچی نشستوں کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ میں نہیں بھلا سکتی وہ گلاب جو ان کے لان میں کھلتے تھے۔ وہ مسکراہٹ جو آنٹی قمر کو دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر آ جاتی تھی۔ جب وہ پارس، مارئی اور سرمد کو دیکھتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں خاص چمک آ جاتی تھی۔ گویا وہ پھول ہوں تارے ہوں، سندھی زبان کے تسلسل کے امین ہوں! ڈاکٹر تنویر کا گھر ایک جنت کی طرح تھا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اُن کے بچے ان کی شخصیت کا عکس ہیں۔ دل ریشم اور پشم جیسا نرم، ارادے فولاد کی

طرح مضبوط اور نبھانے والے!۔
ڈاکٹر تنویر عباسی کی سماجی، علمی، ادبی اور مسیحائی خدمتیں قابلِ تحسین ہیں۔ ان کی ساری زندگی مستقل جنگ تھی۔ جہالت کے خلاف، بے انصافی کے خلاف اور مرض کے خلاف ان کی جنگ کا انداز اپنا تھا۔ مسکراتے مسکراتے بڑے معرکے خاموشی سے سر کر لیتے تھے۔ اُن کا گھر اس بات کا گواہ ہے کہ ان کے گھر ہر وقت سندھ کا مقدر سنوارنے کی تیاری کی جاتی تھی۔ دیپ سے دیپ جلتا تھا۔ ایاز گل، ادل سومرو، مختار ملک اور نوجوان شاعروں کے وہ رہنما تھے یہ ایک ادبی سرمایہ ہے۔''

(گرھو جائوں قبول۔ص:36تا39)

عبدالغنی سومر

''ہم پرانا آفس چھوڑ کا تچل چیئر کی نئی بلڈنگ میں منتقل ہوئے جو ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے بنوائی تھی۔ پہلے دن ڈاکٹر صاحب ایک کیک لے کر آئے جو ان کی شریکِ حیات ڈاکٹر قمر نے بڑی محنت سے خود بنایا تھا۔ اس وقت تچل چیئر کا اسٹاف آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ اُستاد محمد علی حداد ریسرچ آفیسر، ایاز گل ریسرچ اسسٹنٹ، سکندر علی تالپور بک بائنڈر، حاتم پہوڑ ڈرائیور، محمد عرس خاصخیلی مالی، عبدالخالق ؟؟؟، وزیر حسن مری کوتوال اور اشرف مسیح سوئیپر تھا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پورے سٹاف کو غور سے دیکھا اور اشرف مسیح سوئیپر کی غیر موجودگی کی وجہ پوچھی، میں نے عرض کیا:

''وہ صبح آیا تھا آفس صاف کر کے چلا گیا''۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا

''بابا آئندہ ایسے نہیں ہونا چاہیے وہ ہمارا ساتھی ہے اسے قسم کی تقریبات میں اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس قسم کی غلطی دوبارہ نہ ہو''۔

میں حیران ہو گیا۔ پورے سٹاف کے چہرے پر تعجب نمایاں تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا، اُن کے چہرے پر ایک مکمل انسان ہونے کی چمک نظر آئی۔ میری گردن شرم سے جھک گئی۔ واقعی انسان بننا بہت مشکل ہے۔

(ڈاکٹر تنویر عباسی کے ساتھ بتائے ہوئے کچھ پل، عبدالغنی سومرو)

(میں تنویر ہوں، ص:133، عباسی کلھوڑا تنظیم2004،

تصانیف

شعری تصانیف

(1)رگیں ہوئیں رباب (رڳون ٿيون رباب)

تنویر کا یہ پہلا شعری مجموعہ تھا، جو مارچ 1958ء میں، مقبول بھٹی نے، سندھی کتاب گھر، حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں 1955ء سے لے کر 1958ء تک کا کلام شامل کیا گیا تھا، جس میں 18 گیت، 20 نظمیں اور 44 غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن آگم پبلشنگ ایجنسی، حیدرآباد نے 1958 میں شائع کیا۔

(2)شعر (شعر)

تنویر عباسی کا یہ دوسرا شعری مجموعہ، بحیثیت پبلشر رشید بھٹی نے اپنے ادارے سندھو کتاب گھر، سکھر کی طرف سے 1970ء میں شائع کیا، جس میں 1959ء سے 1970ء تک کی شاعری شامل تھی۔ قمر تنویر کو منسوب کیے گئے اس مجموعۂ کلام میں متفرق شاعری دی گئی ہے جس میں "سندھ کا کینڈا ردا" دو داستانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں چینی، یونانی، امریکی، جرمن اور فرینچ شاعری کے تراجم بھی شامل ہیں۔

(3)سورج هتھیلی کے نیچے (سج تريءَ هيٺان)

تنویر کا یہ تیسرا مجموعہ 1977 میں پبلشرز زنذر سنز نے حیدرآباد سے شائع کیا، جس کا انتساب الطاف اور شوکت کے نام ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں 1971ء سے 1977ء تک کی تخلیقات شامل ہیں۔ مقدمہ امداد حسینی نے تحریر کیا تھا اور اس میں نظم، بیت، غزل، وائی، ٹیڑو کی اصناف شامل ہیں۔

(4)یہ دھرتی (هيءَ ڌرتي)

تنویر عباسی کا یہ چوتھا شعری مجموعہ، جس میں 1977ء سے لے کر 1985 تک کی شاعری موجود ہے، سندھی ادیبوں کی سہکاری سنگت کی جانب سے 1985ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ جس کے ناشر محمد ابراہیم جویو تھے۔ مجموعۂ کلام کا انتساب موتی پرکاش اور کلا پرکاش کے نام ہے۔ اس مجموعے میں غزل، وائی، گیت، نظم، بیت شامل ہیں۔

(5)تنویر کہے (تنوير چئي)

تنویر کا یہ شعری مجموعہ، پہلے شائع شدہ چار مجموعات کو یک جا کر کے، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالا جی کی طرف سے 1989ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس میں "رگیں ہوئیں رباب" (رڳون ٿيون رباب) "شعر" (شعر)، "سورج ہتھیلی کے نیچے" (سج تريءَ هيٺان) اور "یہ دھرتی" (هيءَ ڌرتي) کی شاعری کے علاوہ 1950 سے 1954 تک شاعری وبھی شامل کیا گیا ہے۔ جب وہ بزم خلیل کے روایتی حلقۂ احباب کے زیرِ اثر تھے۔ "تنویر کہے" (تنوير چئي) 536 صفحات پر مشتمل ہے۔

(6)ساجن، حسن، شعور (ساجن، سونهن، سُرت)

تنویر عباسی کا آخری اور چھٹا شعری مجموعہ، روشنی پبلی کیشن کنڈیارو نے 1996ء میں شائع کیا، جس کا انتساب مارئی اور رانول کے نام ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں 10 غزلیں، 19 وائیاں، 20 نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مسجد کے ہائیکو، خیر پور کے ہائیکو، دبئی کے ہائیکو اور ٹیلی فون کے ہائیکو بھی دیے گئے ہیں۔

نثری تصانیف

(1)گھوم کے دیکھی دنیا (ڏوري ڏوري ڏيهه)

تنویر کا یہ سفر نامۂ یورپ، سوہنی پبلی کیشن، حیدر آباد نے 1984ء میں شائع کیا تھا۔ کتاب کا انتساب، تنویر نے اپنے فرنچ ٹیچر کیس ڈی گروٹ اور ان کی شریکِ حیات للّی کے نام کی ہے۔ 233 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے میں برطانیہ، اٹلی، فرانس، یونان اور ہالینڈ کی یادیں قلم بند کی گئی ہیں۔ تعارفی کلمات طارق اشرف نے لکھے ہیں۔

(2)ترورا(ترورا)

تنویر عباسی کی یہ نثری تصنیف، سوجھی پبلی کیشن، حیدرآباد نے 1988ء میں شائع کی۔ لعل محمد جونیجو کو منسوب کی گئی اس کتاب میں ادبی مضامین، مختلف شخصیات پر خاکے، کتابوں کے پیش لفظ، یادداشتیں، انٹرویو اور دبئی کا سفرنامہ شامل ہے۔ یہ کتاب 205 صفحات پر مشتمل ہے۔

(3)مشعل جن کے چھے(منهن تنين مشعل)

نیو فیلڈس پبلی کیشن، حیدرآباد نے یہ کتاب 1990ء میں شائع کی، جس کا انتساب تنویر عباسی نے اپنی شاعرہ بیٹی پارس کے نام، اُن کے آرکیٹیکٹ بننے پر، بطور تحفہ کیا تھا۔ 136 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ تنویر نے ہی لکھا ہے۔ اس کتاب میں 16 مختلف معروف شخصیات کے خاکے ہیں۔ جن میں علامہ آئی آئی قاضی، حیدر بخش جتوئی، مولانا گرامی، عابدہ پروین، نسیم کھرل اور دیگر شامل ہیں۔

(4)آگے جانا ھے مجھے(سون کي اڳتي وڃڻو آهي)

روشنی پبلی کیشن، کنڈیارو نے، تنویر کے اس سفرنامے کو 2001ء میں، تنویر کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ اس کتاب میں یورپ، امریکا اور دبئی کے سفرنامے شامل ہیں۔ 192 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے میں کچھ بلیک اینڈ وائیٹ تصاویر ہیں۔

(5)خواب سے خوب صورت حقیقت(سپني کان سُهڻي سچائي)

تنویر عباسی کی تقاریر اور لیکچرز پر مشتمل یہ کتاب کلپنا پبلی کیشن، خیرپور نے 2002ء میں تنویر کی وفات کے بعد شائع کی۔ اس کتاب کو ابراہیم کھرل نے مرتب کیا ہے اور پیش لفظ بھی اُسی نے لکھا ہے۔ 93 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ناشر جبّار امداس ہیں۔

(6)شاہ لطیف کی شاعری(شاھ لطيف جي شاعري)

شاہ لطیفؒ کی شاعری کو جدید تنقیدی اُصولوں اور نئے فکری زاویوں پر پرکھنے کے لیے، تنویر عباسی نے یہ کتاب لکھی جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی پہلی جلد 1976ء میں، دوسری جلد 1985ء میں شائع ہوئی۔ 1989ء میں نیو فیلڈس پبلی کیشن حیدرآباد نے، دو پہلی اور ایک تیسری جلد کو یکجا کر کے شائع کیا۔ روشنی پبلی کیشن کنڈیارو نے 1995ء میں اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کتاب کی پہلی

جلد کا انتساب رشید بھٹی کے نام کیا ہے۔یہ کتاب 294 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف موضوعات پر (شاہ لطیفؒ کے حوالہ سے) 12 مقالات شامل ہیں۔

تحقیق، تالیف، ترتیب و ترجمہ

بحیثیت ایک تحقیقی محقق، تنویر عباسی کی سندھی ادب کے لیے، قابلِ تحسین خدمات ہیں۔ یہ ایک محنت طلب کام ہے، جس میں وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنویر عباسی نے کچھ کتابیں تالیف و ترتیب دیں اور ایک کا ترجمہ کیا۔ ان کتب کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے۔

(1) موت نہ جن کو مار سکی (جي سا زيانه سونٽ)

یہ ایک ویت نامی ناول کا ترجمہ ہے، جسے عوامی کتاب گھر، حیدرآباد نے 1973ء میں شائع کیا تھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار، اپنی دھرتی سے سچی وابستگی رکھنے والا ایک انقلابی نگوین وان تروئی ہے۔ اس کتاب کی 6 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(2) خوش خیر محمد هیسنانی کا کلام (تحقیق و ترتیب)

یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ، جام شورو نے 1982ء میں شائع کی۔ یہ ایک محنت طلب تحقیقی کام تھا جسے تنویر عباسی نے بخوبی سرانجام دیا۔ شاعر کے فن اور اُس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں تنویر نے بھرپور لکھا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کئی قلمی نسخوں سے مدد لی۔

(3) نانک یوسف کا کلام (تحقیق و ترتیب)

تنویر کے اس تحقیقی کام کو سندھی ادبی بورڈ نے 1982ء میں شائع کیا جو کہ ایک محنت طلب کام تھا جسے تنویر نے آٹھ قلمی نسخوں کی مدد سے مکمل کیا۔

(1) بچوں کے بول (انتخاب و ترتیب) (ٻاراڻا ٻولَ)

بچوں کے لیے اس کتاب کو تنویر نے محنت سے ترتیب دیا جسے انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی، جامشورو نے 1975ء میں شائع کیا۔ 34 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کشن چند بیوس،

ہوندراج دکھایل، اُستاد بخاری، نادم بچل شاہی، نثار بزمی اور احمد خان آصف کے بچوں کے لیے لکھے گئے گیت اور نظمیں شامل ہیں۔

اس کتاب کا انتساب ''پارس، ماروی، سرمد کے مستقبل کے'' کے نام ہے۔

(2) جدید سندھی شاعری (انتخاب و ترتیب) (جديد سنڌي شاعري)

یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ نے 1981ء میں شائع کی تھی، جس میں 38 جدید نمائندہ شعراء کا انتخاب شامل ہے۔

(4) سرمست۔ ریسرچ جرنل (ترتیب)

سچل سرمست یادگار کمیٹی، خیر پور، ہر سال سچل سرمست کے عرس کے موقع پر گذشتہ سال کی کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات و مضامین کو یکجا کر کے سرمست ریسرچ جرنل میں شائع کرتی ہے۔ تنویر عباسی کی کاوشوں کے نتیجہ میں 1980ء سے یہ جرنل جاری ہوا۔ 1980 سے 1989 تک تنویر نے سرمست کے 9 شمارے ترتیب دیے۔ بعد میں یہ ذمہ داری محمد علی حداد کے حوالے کی گئی اور تنویر بطور سرپرست ان کے ساتھ رہے۔

(5) سندھ کے عظیم صوفی بزرگ

سندھ کے صوفیائے کرام کے افکار و زندگی کے بارے میں تنویر عباسی کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ مذکورہ کتاب میں تنویر نے قلندر لعل شہباز، شاہ عنایت صوفی، سچل سرمست اور دیگر بزرگان کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے۔ جس میں ان صوفی بزرگان کا تعارف شامل ہے۔ تحقیقی کام مختصر ہو یا جامع نوعیت کا، بنیادی بات محقق کی جستجو اور ان کی فکری بلندی ہوتی ہے۔ تنویر نے جو بھی کام کیا، نہایت محنت اور لگن سے کیا ہے۔ یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ جام شورو نے 1981ء میں شائع کی۔

(6) سچل سرمست (انگریزی زبان میں انتخاب و ترتیب)

یہ کتاب سچل چیئر شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی یونیورسٹی، خیر پور نے 1989ء میں شائع کی۔ 98 صفحات

پر مشتمل اس کتاب میں سچل سرمست کے فن و فکر پر مختلف ادیبوں کے 8 مقالات شامل ہیں۔ پیش لفظ ڈاکٹر رشید احمد شاد، وائس چانسلر نے لکھا ہے۔

تنویر عباسی کے بارے میں لکھی گئی کتابیں اور نمبر

مہران تنویر عباسی نمبر

(مهراڻ تنوير عباسي نمبر)

سندھی ادبی بورڈ جام شورو نے 2000 میں "مہران" مخزن کا تنویر عباسی نمبر جاری کیا۔ اس شمارے کے ایڈیٹر نفیس احمد شیخ اور بورڈ کے سیکرٹری تھے غلام ربانی آگرو تھے۔ اس نمبر کے پہلے حصہ میں تنویر عباسی کی کچھ منتخب تحریریں شامل کی گئی ہیں، جس میں کچھ اشعار، ایک کہانی "لوئی"، شاہ لطیف کی شاعری کے حوالے سے، مطالعہ اور ایک تقریر، سفرنامہ یورپ کا کچھ حصہ، شیخ عبدالمجید سندھی پر ایک خاکہ اور تنویر عباسی کا انٹرویو "الفاظ بولتے ہیں" کے عنوان سے ہے۔ نمبر کے دوسرے حصے میں، عبدالنبی عباسی، ارشاد عباسی، رانی ارشاد، مارئی زہیر، غلام ربانی آگرو، حمید سندھی، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، ڈاکٹر سلیمان شیخ، مظہر یوسف، نصیر مرزا، مختیار ملک، ایاز گل، ادل سومرو، مہر خادم، سید امام راشدی، محمد سنبل ذحر، محمد امین بلوچ، صوفی سائیں راز پیر، روف عباسی، نیاز ہمایونی کے تاثرات و مضامین جب کہ پارس تنویر کی دو نظمیں "بابا کی یاد میں" شامل ہیں۔ تنویر عباسی نمبر کے آخر میں الیاس عشقی، تاجل بیوس، مقصود گل، مختار گھمر و کا منظوم خراج عقیدت شائع کیا گیا ہے۔ 216 صفحات پر مشتمل اس نمبر میں تنویر کی کچھ نایاب اور یادگار تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ ٹائٹل پر ڈاکٹر تنویر کی ایک مسکراتی رنگین تصویر شائع کی گئی ہے۔

تنویر عباسی۔ ایک مطالعہ

(تنوير عباسي - هڪ مطالعو)

ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کی تصنیف کردہ یہ کتاب گنج بخش کتاب گھر، حیدرآباد نے مئی 2000ء میں شائع کی ہے۔ تنویر عباسی کی شخصیت، فن اور فکر کے حوالے سے تحقیقی انداز میں لکھی گئی اس کتاب کے

مطالعے سے تنویر عباسی کی ذات اوران کی تخلیقات کا پورا تعارف ہو جاتا ہے۔اس کتاب میں بطور ضمیمہ، الطاف عباسی کی کتاب جاڑے چاند اور پارس تنویر کی کتاب ریشمی آواز کا تعاف اور آخر میں ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کو لکھے گئے تنویر عباسی کے خطوط کو بھی شامل کیا گیا ہے۔144 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی سرورق پر تنویر عباسی کی ایک خوبصورت تصویر(دوران خطاب) دی گئی ہے۔

بھٹائی جرنل کا ڈاکٹر تنویر عباسی نمبر
(ڀٽائي جرنل جو ڊاڪٽر تنوير عباسي نمبر)

شعبہ سندھی، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور کا جاری کردہ بھٹائی ریسرچ جرنل کا(ساتواں شمارہ، دسمبر 2002ء) ڈاکٹر تنویر عباسی نمبر شائع کیا گیا۔جرنل کے سرپرستِ اعلیٰ ڈاکٹر عبدالرحیم ملک، وائس چانسلر، سرپرست پروفیسر عبداللہ پھلپوٹو، ڈین فیکلٹی آرٹس ہیں، جب کہ ایڈیٹوریل بورڈ میں، ڈاکٹر ملک ندیم، ایاز گل، ڈاکٹر ادل سومرو، برکت بلوچ اور زاہدہ پروین مری شامل ہیں۔ابتدائی کلمات ڈاکٹر ملک ندیم کے ہیں جب کہ تنویر کی شخصیت، فن اور فکر کے بارے میں، ڈاکٹر عبدالرحیم ملک، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، ڈاکٹر نواز علی شوق، ڈاکٹر فہمیدہ حسین، ڈاکٹر ہدایت پریم، ڈاکٹر ملک ندیم، مونس ایاز، ایاز گل، برکت بلوچ، انور نگار ہکڑو، پروفیسر اعجاز قریشی، بخل شاہ بخاری، مختیار ملک، ممتاز بخاری، مہر خادم، خواجہ سلیم، پارس عباسی، حزب اللہ آئی سومرو، قاسم ملک، نادر علی تاج ابڑو، طارق عزیز شیخ، شہناز سومرو اور زاہدہ پروین کے تاثرات، مقالات ومضامین شامل ہیں۔198 صفحات پر مشتمل اس نمبر کے سرورق پر تنویر عباسی کی ایک یادگار تصویر شائع کی گئی ہے۔

میں تنویر ہوں (مان تنوير آهيان)

174 صفحات پر مشتمل یہ کتاب، عباسی کلہوڑا تنظیم سندھی کی طرف سے پگ دار حاجی منور علی عباسی نے لاڑکانہ سے 2004ء میں شائع کی ہے اور اس کے مرتب مشتاق احمد کلہوڑو ہیں۔کتاب کے ابتدائی صفحات میں حاجی منور علی عباسی، ڈاکٹر غلام علی سائنگی، سکندر علی عباسی، انجینئر عثمان علی اور مرتب مشتاق علی کلہوڑو کی چند باتیں، ابتدائی کلمات و گزارشات شامل ہیں۔تنویر عباسی کی یاد میں جاری کردہ اس نمبر میں ریاضت برڑو، ایاز گل، احسان دانش، سکندر عباسی، تاجل بیوس، جہانگیر عباسی، عبدالغنی سومرو، رضوان گل، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، مشتاق بخاری، منور مغیری، خواجہ ذوالفقار اور وحید محسن کے مقالات، تاثرات ومضامین شامل ہیں۔ٹائٹل پر تنویر عباسی کا خوبصورت اسکیچ ہے جسے منور ابڑو نے ڈیزائن کیا ہے۔

"کاش ہوجائوں قبول" (ہوان شل قبول)

شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور کے تنویر عباسی کارنر کی طرف سے شائع کردہ اس کتاب کے مرتب ایاز گل ہیں۔ 130 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2005ء میں شائع کی گئی۔ ابتدائی کلمات ایاز گل نے لکھے ہیں، جب کہ ڈاکٹر عبدالرحیم ملک، ڈاکٹر قمر تنویر، نور جہان عباسی، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، تاج جویو، ڈاکٹر ملک ندیم، ڈاکٹر یاسمین قاضی، ادل سومرو، مختیار ملک، منیر سولنگی، پارس حمید، اختر درگاہی، پروفیسر نظیر احمد سومرو، ابراہیم کھرل، سرور سیف، مہر خادم، قدیر انصاری، امر اقبال، جہانگیر عباسی اور فتاح ملک کے تاثرات، مقالات و مضامین شامل ہیں۔ فرخ ملک کا مضمون انگریزی میں ہے جب کہ دیگر تحریریں سندھی میں ہیں۔ یہ سب تحریریں تنویر عباسی سیمینار 2004ء میں پڑھی گئی تھیں۔ سرورق پر تنویر عباسی کی دل کش تصویر خدا بخش ابڑو نے کیمرہ میں محفوظ کی تھی۔ جسے منور ابڑو نے ڈیزائن کیا ہے۔

تاثرات، مقالات و مضامین کی فہرست

1- میرا پیارا بھائی، عبدالنبی عباسی، مہران۔ تنویر عباسی نمبر سندھی ادبی بورڈ جامشورو، 2000/1 ایڈیٹر۔ نفیس احمد شیخ۔

2-	ادا تنویر، ارشاد عباسی	ایضاً
3-	تاثر، رانی ارشاد	ایضاً
4-	آنکھیں میگھ ملہار، غلام ربانی آگرو	ایضاً
5-	تنویر۔ عجیب فقیر، حمید سندھی	ایضاً
6-	تنویر عباسی۔ نثری کاوشیں اور تحقیق، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو	ایضاً
7-	چلے تو اک پل، ڈاکٹر سلیمان شیخ	ایضاً
8-	تنویر عباسی ایک اچھا دوست اور معتبر دانشور، مظہر یوسف	ایضاً
9-	کیا جانوں محبوب تھے کون، نصیر مرزا	ایضاً
10-	تنویر کتھا، مختیار ملک	ایضاً
11-	مار سکی نہ موت جنہیں، ایاز گل	ایضاً
12-	تنویر عباسی اور نئی نسل، ادل سومرو	ایضاً
13-	تنویر عباسی اور یادوں کے عکس، مہر خادم	ایضاً

-14 تنویر عباسی۔ بچل کا پارکھو، سید امام المتقین راشدی — ایضاً

-15 تنویر عباسی۔ ایک میٹھا انسان، محمد جمل ڈھر — ایضاً

-16 جوگی گئے شاید جروت، محمد امین بلوچ — ایضاً

-17 تن من میں تنویر کی یاد، صوفی سائیں راز پیر — ایضاً

-18 تنویر۔ ہمہ گیر مصنف اور انسان، رؤف عباسی — ایضاً

-19 شام کا سورج، نیاز ہمایونی — ایضاً

-20 کچھ پل کے لیے بیٹھو، ڈاکٹر عبدالکریم ملک، بھٹائی۔ جرنل، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور، 2002ء، مرتب: ڈاکٹر ملک ندیم

-21 کچھ باتیں کچھ یادیں، ڈاکٹر عبدالجبار — ایضاً

-22 بادل کی طرح آنسو برسیں، ڈاکٹر نواز علی شوق — ایضاً

-23 تنویر عباسی۔ ایک نقاد ایک محقق، ڈاکٹر فہمیدہ حسین — ایضاً

-24 تنویر عباسی کی شاعری کی زبان، ڈاکٹر ہدایت پریم — ایضاً

-25 تنویر عباسی کی شاعری کی علامتیں، ایاز گل — ایضاً

-26 تنویر عباسی۔ آخر دم تک پہاڑ، ملک ندیم — ایضاً

-27 تنویر عباسی۔ فرنچ کرسٹل میں سرسوں کا پھول، مونس ایاز — ایضاً

-28 تنویر عباسی کا زندگی کے بارے میں نظریہ، برکت بلوچ — ایضاً

-29 ہم فرشتے نہیں لوگو، انور نگار ہکڑو — ایضاً

-30 پوخوہار کی مٹی میں مدفون سندھ کا اجالا، پروفیسر اعجاز قریشی — ایضاً

-31 تنویر کا ذکر، بچل شاہ بخاری — ایضاً

-32 جلنا ہمارا ایسا ہے، مختیار ملک — ایضاً

-33 تنویر عباسی، سحرِ فطرت کو دریافت کرنے کی جستجو کرنے والا، ممتاز بخاری، ایضاً

-34 تنویر عباسی کی ابتدائی شاعری، مہر خادم — ایضاً

-35 میں اُس کے دوست ہونے کے ناطے، خواجہ سلیم — ایضاً

-36 میرا بابا۔ کچھ یادیں کچھ باتیں، پارس عباسی — ایضاً

-37 خوبیوں کی کان۔ ڈاکٹر تنویر عباسی، حزب اللہ۔ آئی سومرو — ایضاً

-38 تنویر عباسی کی شاعری میں پھولوں کا تذکرہ، قاسم ملک — ایضاً

-39 کوئی کوئی بندہ موتی دانہ، نادر علی تاج ابڑو — ایضاً

40- تنویر عباسی کی شاہ پر کی ہوئی تحقیق وتنقید، طارق عزیز شیخ — ایضاً

41- تنویر اور اس کی تخلیق، شہناز سومرو — ایضاً

42- تنویر کی شخصیت، زاہدہ پروین مری — ایضاً

43- اس جگ کو راہ دکھاتی ہے، ریاضت برڑو، کتاب "میں تنویر ہوں" عباسی کلہوڑا تنظیم سندھ، 2004ء، مرتب: مشتاق علی کلہوڑو

44- ڈاکٹر تنویر عباسی (شخصیت، فن اور فکر)، احسان دانش — ایضاً

45- ڈاکٹر تنویر۔ محبتوں کا سفیر، سکندر عباسی — ایضاً

46- پریم نگر کے ہر گھر کا باسی۔ تنویر عباسی، تاجل بیوس — ایضاً

47- ڈاکٹر تنویر عباسی کے فن اور شخصیت کا جائزہ، جہانگیر عباسی — ایضاً

48- تنویر عباسی کے ساتھ بیتی ہوئی کچھ گھڑیاں، عبدالغنی سومرو — ایضاً

49- ڈاکٹر تنویر عباسی جدید شاعری کا ایک اہم نام، رضوان گل — ایضاً

50- ڈاکٹر تنویر عباسی (تحقیق کے لیے منصوبہ بندی)، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو — ایضاً

51- تنویر خود آنسو بن گیا، مشتاق بخاری — ایضاً

52- تنویر نے کی پرواز، مور مغیری — ایضاً

53- تنویر عباسی۔ حسن، محبت، انسانیت اور مستقبل کا شاعر، خواجہ ذوالفقار — ایضاً

54- تنویر عباسی۔ دھرتی اور حسن کا شاعر، وحید محسن، — ایضاً

55- تنویر۔ سچ کا ساتھاری، پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحیم ملک، کتاب "ھوان شل قبول" ٹی ھو ہوں قبول" تنویر عباسی کارنر، مرتب: ایاز گل، شاہ لطیف" یونیورسٹی، خیرپور، 2005ء

56- انسان دوست۔ تنویر، ڈاکٹر قمر تنویر — ایضاً

57- میرا بھائی۔ میرا دوست، نور جہان عباسی — ایضاً

58- اوجین بجانے والے جوگی، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو — ایضاً

59- روشنی اور زندگی کا شاعر تنویر، تاج جویو — ایضاً

60- تنویر عباسی۔ ایک رومانوی شاعر، ڈاکٹر ملک ندیم — ایضاً

61- کھلا ہوا انچھوتا پھول، ڈاکٹر یاسمین قاضی — ایضاً

62- آپ کی ٹرین کسی وقت بھی آسکتی ہے، ادل سومرو — ایضاً

63- اور بھی آگے، بختیار ملک — ایضاً

64- میں تنویر ہوں۔ کاش ہو جاؤں قبول، منیر سولنگی — ایضاً

65- بکھریں نہ تیری باتیں، پارس حمید ایضاً
66- ایک مردِ قلندر۔تنویر، اختر درگاہی ایضاً
67- تنویر کی شاعری کی ایک جھلک، پروفیسر نذیر احمد سومرو ایضاً
68- خوبصورت دل کا مالک شاعر۔تنویر عباسی، ابراہیم کھرل ایضاً
69- سچ، حسن اور شعور کا پیکر۔تنویر، سرور سیف ایضاً
70- تنویر عباسی کی شاعری میں آفاقیت، مہر خادم ایضاً
71- تنویر عباسی اور اُن کے کچھ اہم کام، قدیر انصاری ایضاً
72- تنویر اور تخلیق کا خاموش شہر، امر اقبال ایضاً
73- ڈاکٹر تنویر عباسی کی انقلابی شاعری، جہانگیر عباسی ایضاً
74- بحیثیت جدید شاعر تنویر کی شعری ندرت (انگریزی میں)، فرخ ملک ایضاً
75- مرحوم شاعر کا سماج (انگریزی میں)، آصف فرخی، روزنامہ
ڈان، دی۔ریو 15-9، دسمبر 1999ء
76- شاعر کی خواہش (انگریزی میں)، رکھوتا ایضاً

☆ تحقیقی کام ''تنویر عباسی کی ادبی خدمات'' کا تحقیقی جائزہ''۔شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے سندھی شعبہ میں لکھا گیا ایم فل کے لیے تحقیقی مقالہ۔سال 2000ء۔ریسرچ اسکالر، مہر خادم۔

الوداعی لمحات میں تخلیق کی تڑپ

تنویر عباسی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی مصنوعی انداز نہیں اپنایا اور نہ ہی وہ بناوٹ کو پسند کرتے تھے۔PIMS اسلام آباد کے ICU میں، جب ڈاکٹروں نے انہیں مصنوعی طریقہ سے زندہ رکھنے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اُدھاری زندگی جینا نہیں چاہتے۔ زندگی کے اُن الوداعی لمحات میں بھی اُنہیں تخلیق کی تڑپ رہی اور اپنی آخری نظم بھی انہوں نے ہسپتال کے بستر پر لکھی۔ سندھی میں لکھی گئی وہ نامکمل نظم یہ تھی:

ترجمہ:

ترجمہ	سندھی
کوئی کوئی پل ہوتا ہے تنویر	ڪوڪوپل ٿئي تو تنوير
صدیوں پر بھی حاوی	صدين تي ٻي سوڀارو
عشق شہد جیسا ہے بس	آ بس عشق مٺي ماکي
ویسے جیون تو ہے چھتا	هونءَ ته حياتي مانارو
عجب کہ آخر تم تک پہنچا	عجب ته توتائين پهتو
جو جو چارا میں نے کیا	جو جو ورتو سون چارو
جیون ہے اندھیرا کمرا	جيون اونداهي ڪوٺي
روشن جھروکا، تیرا چہرا	تنهنجو مک روشن جارو

ہسپتال کے بستر پر تنویر عباسی کی لکھی ہوئی آخری نظم کا ترجمہ

ترجمہ	سندھی
خون کا دان ہی مانگتے ہیں	ربج گهرن ٿا رت جوني
سارے کھیت کھلیان ہم سے	ٻني ٻني ٻارو ٻارو
ڈھونڈو گر جو مل سکے	ڳولي وٺ جي ملي سگهني
کوئی انساں میرے جیسا	مانهو ڪوني مون ٻارو
جینا ہمارا ایسا ہے	جيئڻ اسان جو اهڙو آهي
جہاں جاتے ہیں زندگی ہے	جتي وڃون ٿا زندگي آ

جلنا ہمارا کچھ ایسا ہے	ٻرڻ اسانجو ڪجھہ اھڙو آھي
جہاں جاتے ہیں زندگی ہے	جتي وڃون ٿا تہ روشني آ

(ترجمه: ا۔س)

ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد کچھ ادیب دوستوں نے تنویر سے ملاقات کی، انہوں نے جو آخری پیغام دیا تھا وہ 'کاوش' روزنامہ، 26 نومبر 1999ء میں، ان کی وفات کی خبر کے ساتھ شائع ہوا:

> ''زندگی بڑی خوبصورت ہے، میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں موت سے لڑوں گا اور اُسے شکست دوں گا۔ میں کائنات کی ہر چیز سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے سندھ اور سندھی لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا کوئی بھی دشمن نہیں ہے۔ سندھ کے لیے میرا ایک ہی پیغام ہے کہ جیے سندھ۔''

تنویر کا آخری سفر اور منفرد وصیت

تنویر عباسی کو اپنے بیٹے سرمد عباسی سے بہت محبت تھی۔ جب سرمد اپنی تعلیم مکمل کر کے، امریکا سے کمپیوٹر سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اسلام آباد آ کر بسے تو تنویر کی خواہش تھی کہ وہ اور ان کی بیگم ڈاکٹر قمر، زندگی کے باقی ایام اپنے بیٹے کے ساتھ گزاریں۔ سرمد کافی عرصہ باہر رہے تھے۔ تنویر عباسی کے اسلام آباد جانے کے فیصلے پر ادبی حلقوں میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خاص طور پر خیر پور کے نوجوان شعراء زیادہ مایوس ہوئے۔ کہ وہ اپنے سرپرست، رہنما اور ایک مخلص ساتھی سے محروم ہونے والے ہیں۔ تنویر کا یہ موقف تھا کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی، دوسروں کے لیے گزاری ہے، اب جب کہ وہ آہستہ آہستہ ناتواں اور بوڑھے ہو رہے ہیں تو وہ اپنی مرضی سے، اپنے محبوب بیٹے کے ساتھ جینا چاہتے تھے۔ ایک مہینے تک اخبارات میں بیانات اور اپیلیں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن وہ مشکل گھڑی آ ہی گئی جب تنویر عباسی نہایت محبت اور اپنی پسند سے تعمیر کرائے گئے، اپنے مسکن "سرمد جو گھر" سے پُرنم آنکھوں سے رخصت ہوئے۔ وہ گھر جہاں انہوں نے کئی برس گزارے، خواب دیکھے، اشعار لکھے اور پھول پودے اُگائے جو تنویر کی کمزوری تھے۔

میں نے گلاب لگائے ہیں
تتلیاں خود ہی آئی ہیں

(تنویر)

جمعہ 12 نومبر 1999ء کی وہ رات، جب ہم روہڑی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پنڈی جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ (تنویر عباسی، ڈاکٹر قمر تنویر اور میں) ٹرین لیٹ تھی۔ کیا خبر تھی کہ وہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ ٹرین آئی اور تنویر عباسی اپنی شریک حیات کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

ٹرین اُس کی جس طرف کو جا چکی ہے
میں ابھی تک اُس طرف ہی دیکھتا ہوں

(تنویر)

اپنے محبوب بیٹے ڈاکٹر سرمد کی محبت، تنویر کو اسلام آباد کھینچ کر لے گئی، لیکن وہاں کی آب و ہوا انہیں

راس نہ آئی اور وہ اپنے خاندان کے افراد، پرستاروں اور چاہنے والوں سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔
تنویر عباسی نے اپنی زندگی میں ہی، اپنی آنکھیں اور جسم (مرنے کے بعد) لیاقت میڈیکل کالج، جامشورو کو بطور عطیہ دینے کی وصیت کر دی تھی۔ PIMS اسلام آباد میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے وصیت میں ترمیم کرتے ہوئے اپنا جسدِ خاکی، علم کے فروغ کے لیے، کسی بھی ادارے کو دینے کی خواہش کی تھی۔ تنویر کی آنکھیں تو وصیت کے مطابق ایک بچی کو منتقل کر دی گئیں لیکن خاندان کے افراد میں اختلاف رائے کی وجہ سے، تنویر عباسی کی دوسری خواہش کہ اُن کا جسدِ خاکی کسی میڈیکل کالج کے سپرد کیا جائے، پوری نہ ہو سکی۔
تنویر عباسی کی اس منفرد وصیت کا نوجوانوں پر کافی اثر ہوا۔ کئی ادیبوں اور شاعروں نے بعد از مرگ اپنی آنکھیں عطیہ میں دینے کے اعلانات کیے۔ شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیر پور میں تنویر عباسی کی یاد میں منعقد کردہ پروگرام میں بھی اس قسم کے اعلانات ہوئے۔ سندھ کے علاوہ راولپنڈی اور اسلام آباد کے روشن خیال حلقوں میں اس منفرد وصیت کے اثرات نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا اور کئی افراد نے اپنے وصیت نامے لکھ دیے کہ بعد از مرگ ان کے جسدِ خاکی کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اخبارات کے مطابق اس نئی تحریک کی بنیاد محمد اقبال بالی نے رکھی تھی۔ جنھوں نے خود بھی اس قسم کی وصیت اسٹامپ پیپر پر لکھ کر اپنے لواحقین کے حوالے کی ہے۔

ے مٹی میں مٹی بن جائیں کتنے پیارے لوگ

(تنویر)

ے اپنے ہاتھوں سے مٹی میں
مجھ کو وہ دفنائے گا
ے میرا ساجن آئے گا

(تنویر)

''پوٹھوہار کی اس مٹی میں، موہیے کی مہک جیسا سندھ کا صوفی شاعر دفن ہے۔ جس نے امن، انسانیت، پیار محبت اور مٹی کے گیت لکھے لیکن اُسے اپنے دیس کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ جب بھی یہاں سے گزریں تو اس مسافر شاعر کی تربت پر، اپنی نیک تمناؤں کے دو چار پھول رکھنا نہ بھولیے گا، کیوں کہ اُسے پھولوں سے زیادہ محبت تھی۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نور الٰہی

ڈاکٹر تنویر عباسی

جنم: 7 دسمبر 1934ء

تاریخِ وفات: 25 نومبر 1999ء

انا للہ وانا الیہ راجعون

پلاٹ نمبر 89 قبر 150

ڈاکٹر تنویر عباسی سچل سرمست کے عاشق اور منصور حلاج کے عقیدت مند تھے۔ حلاج نے سولی پر اپنے قاتلوں کو محبوب کہا اور اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے دیے۔ شاید تنویر عباسی نے بھی ویسا ہی انتخاب کیا تھا۔ اس جدید صوفی کی وصیت کا انتہائی احترام کرتے ہوئے میں ذاتی طور پر اس سرسوں کے پھول جیسے شاعر کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اور نہ ہی ان کی وصیت کا خون۔ میں نے ان کے لواحقین سے گزارش کی تھی کہ ان کے جسدِ خاکی کی بقایاجات (Mortal Ramains) ہسپتال کے بعد خیرپور لائی جاتیں، تاکہ شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی کی انتظامیہ سے اجازت لے کر، سچل چیئر کے آنگن میں ان کو دفنایا جاتا۔ انہیں سچل چیئر سے عشق تھا۔ وہ اس کے معمار تھے، اس درس گاہ کے تاحیات اعزازی پروفیسر تھے۔ وہاں ان کی یادگار قائم کی جاتی۔ عمر خیام کی طرح گنبدِ نیلوفر نہ سہی، کوئی زین مت صوفیوں جیسا چھپرا بنا کر، ایک یادگار قبر بنائی جاتی اور کوئی خاص کارنر قائم کرتے۔

(مونس ایاز)

(بھٹائی جرنل 7۔ 2002ء۔ تنویر عباسی نمبر، شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی یونیورسٹی، خیرپور۔ ص 52)

منظوم خراج عقیدت

نیاز ھمایونی

زندگی میں جو پھولوں کی طرح
کھلتا رہا
وہ تنویر ہم سے جدا ہو گیا
وہ ایک انسان دوست بندہ
شاعری میں بھی تھا
وہی انداز اُس کا
بہاروں کی طرح تھا خود بھی
اور رکھا اپنے گھر اور بچوں کو
خوشیوں کے موسم میں
الوداعی لمحوں میں جیے سندھ کہہ کر
امر ہو گیا وہ
جو ویسے امر تھا
ہم ان کی وصیت کا کرتے ہیں احترام
جس سے انسانیت کو
ملے گا ایک نیا درس

(روزنامہ 'عبرت' حیدر آباد، 27 نومبر 1999ء)

تاجل بیوس

ہم آج اپنے ہونے کا انکار کرتے ہیں
تب تو اے تنویر! تم سے پیار کرتے ہیں
ہر آدمی ہے اب تک ہمارے لیے آدمی
اس لیے ہر آدمی پر اعتبار کرتے ہیں

(مہران۔تنویر عباسی نمبر۔2000ء۔سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، ص۔208)

الیاس عشقی جیسے بزرگ ادیب وشاعر نے تو تنویر عباسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے، سندھی میں سُر تنویر عباسی لکھا، جس میں سے چند ابیات کا ترجمہ حاضر ہے۔

الیاس عشقی

موتی تھا تنویر، دنیا میں انمول
اُس کے میٹھے بول، وقت دھرائے گا سدا

☆☆☆☆

مجھے ملایا ''راز''، ''تنویر'' اور ''ایاز'' سے
اب میری آواز سنتے ہی نہیں

☆☆☆☆

سامی، بچل، شاہ، شاعر تینوں عظیم تھے
چلے اُن کی راہ، ''تنویر'' اور ''ایاز'' بھی

☆☆☆☆

مجھے کوئی نظیر، اُن سا لگا نہ سندھ میں
پیکر تھا تنویر، سندھڑی کی تہذیب کا

(مہران۔تنویر عباسی نمبر۔2000ء، ص۔206)

پارس عباسی

چاہے پاس نہ آئے کوئی
وہ تو پھر بھی آئے گا

میرا بابل آئے گا
☆ جانب اور عمیر کو وہ
تتلیوں سے بہلائے گا

میرا بابل آئے گا
میرے اندھیرے کمرے میں
روشنی وہ لائے گا

میرا بابل آئے گا
☆☆ مارگلا کی گود میں کوئی
شعر نیا سنائے گا

میرا بابل آئے گا

(☆)پارس کے بیٹے(☆☆)مارگلا۔ پہاڑ،اسلام آباد)

Dearest Baba

As a little girl, i remember you, singing songs to me.
I remember you strong, with your utter gentleness.
your understanding made me flourish.
My queries; well answered by you.
My little mind grew, nurtured with your love, it learnt to search;
Know the right from wrong.
You showed me the paths, and encouraged my to make may choices.

You made me fearless.

You made me think.

You made life a beautiful experience.

You'd say.

"I've faith in you."

"Go ahead, You're my future and my future should go steps ahead of me."

Baba, you're my deep shadow, my courage to go on.

You're one reason, I believe in love and gentleness and goodness and in truth.

I yearn to live, as you wanted me to.

I treasure each contact of Yours; and yours memories.

Your memories are sweet and innocent, and very brave; strengthe.

Marvi Zaheer

ادل سومرو

سب کے لیے جو کھلتا تھا، اب بند ہوا وہ در
کتنا اُداس لگا رہا ہے، سرمد کا یہ گھر

☆☆☆☆

ویسے تو ہر بندے کی ہے، اپنی اپنی آن
میروں والے شہر میں مشکل تم جیسا انسان

☆☆☆☆

تم بن سائیں، دکھی ہو جیسے تیری ہر تحریر
میر واہ کے پنچھی پوچھیں، کہاں گیا تنویر

وائی بنام تنویر

ادل سومرو

جیسے اُجرے گیت اُسی کے
خود بھی ویسا ہے
بندہ ایسا ہے
حسن کا ہے وہ پجاری
پھولوں جیسا ہے
بندہ ایسا ہے
انجانی دنیا میں وہ
اپنا لگتا ہے
بندہ ایسا ہے
دھرتی کا وہ موضوع
سب سے ملتا ہے
بندہ ایسا ہے

(7 دسمبر 1993ء کو تنویر کے جنم دن پر ان کو پیش کی گئی تھی)

ببلو گرافی

1- الطاف عباسی، "جاڙا چنڊ"؛ "جڑواں چاند"، سندھی ادیبوں کی کوآپریٹو سوسائٹی، حیدرآباد۔

2- ایاز گل (مرتب)، "پوان شل قبول"؛ "کاش ہو جاؤں قبول" تنویر عباسی کارنر، شاہ لطیفؒ یونیورسٹی، خیرپور، 2005ء

3- تنویر عباسی، "جي ماريا نه موت"؛ "موت نہ جن کو مار سکی"، عوامی کتاب گھر، حیدرآباد، 1973ء

4- "ٻارڙا ٻول"؛ "بچوں کے بول"، سندھالاجی، جامشورو، 1975ء

5- "جديد سنڌي شاعري"؛ "جدید سندھی شاعری"، سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، 1982ء

6- "خوش خير محمد هيساڻي جو ڪلام"؛ "خوش خیر محمد ہیسانی کا کلام"، سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، 1982ء

7- "نانڪ يوسف جو ڪلام"؛ "نانک یوسف کا کلام"، سندھی ادبی جام ورڈ، جامشورو، 1983ء

8- "ترورا"، سوجھی پبلی کیشن، حیدرآباد، 1988ء

9- "تنوير چئي"؛ "تنویر کہے"، سندھالاجی، جامشورو، 1989ء

10- "ترتيب ۽ انتخاب"؛ "(ترتیب و انتخاب) ایچل سرمست (انگریزی میں)، ایچل چیئر، شاہ عبداللطیفؒ یونیورسٹی، خیرپور، 1989ء

11- "مٿن تنين مشعل"؛ "مشعل جن کے چہرے"، نیو فیلڈز پبلی کیشن، حیدرآباد، 1990

12- "شاه لطيف جي شاعري"؛ "شاہ لطیفؒ کی شاعری"، روشنی پبلی کیشن، کنڈیارو، 1995ء

13- "ساجن سُونهن سُرت"؛ "ساجن، حسن، شعور"، روشنی پبلی کیشن، کنڈیارو، 1996ء

14- "سون کي اڳتي وڃڻو آهي"؛ "آگے جانا ہے مجھے"، روشنی پبلی کیشن، کنڈیارو، 2001ء